غالب شناسی

انتخاب

اردو
و
فارسی

معہ دیباچہ

ظ انصاری

کچھ اِس انتخاب کے بارے میں

نیا جاندار شعر وہ ہے جو زرا دیر تک نیا رہے۔ غالبؔ کے ہاں نیا پُرانا سبھی طرح کا شعر ملتا ہے مگر وہ جو اپنے جنم دن سے سوڈیڑھ سو سال بعد آج تک تازہ دم معلوم ہوتا ہے اور خود ہماری زندگی کی پیچدار، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی، دُور دراز تک پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں پر ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے، وہ اِس انتخاب کی نظر سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔

۳۵۰ صفحات کے اس انتخابِ غالب کو چھاننے پھٹکنے میں کم و بیش تین ۳۰۰ سو طویل شامیں تو ضرور کھپی ہیں۔ اور اس مدّت میں اُردو اور فارسی کلام کے وہ سارے اِنتخاب نظر کے سامنے رہے جو پچھلے سو برسوں میں مختلف اہلِ ذوق نے کئے اور چھاپے ہیں۔ خود غالبؔ نے نواب رامپور کی خاطر جو انتخاب (۱۸۶۱ء میں) کیا تھا اور جسے مولانا عرشی نے بڑی نفاست سے، ٹائپ میں (۱۹۴۱ء) کرنل بشیر حسین زیدی کی خاص توجہ کے ساتھ شائع کرایا، وہ اس انتخاب کی بنیاد بن سکتا تھا، لیکن اس میں بھی بعض نئے اور جاندار شعروں کی غیر حاضری سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غالباً شاعر کو اپنے ممدوح یا مخاطب کے مزاج کا زیادہ لحاظ رہتا ہوگا، اپنے بعد والوں کا نہیں، ورنہ اُن کے تخلیقی عمل میں تو تنقیدی عمل بھی ساتھ چلتا رہا ہے۔

اوّل اوّل یہ کام بھی فرمائشی تھا، دو ہزار اشعار میں کلامِ غالبؔ کا ایک اِنتخاب روسی زبان میں شائع ہونا تھا۔ ایک ایک مصرعہ اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا اور ۱۹۶۸ء کے ستمبر تک روسی زبان کے اہلِ علم اور اہلِ اَدب کی خاطر یہ کام مکمّل ہو چکا تب مجھے تشنگی کا احساس ہوا۔ پھر سے سارے اِنتخابوں اور کُلّیات پر نظر ڈالی، تو دیکھا کہ بہت کچھ بچ رہا ہے جس کا لطف اہلِ زبان ہی لے سکتے ہیں، یُوں موٹی چھلنی سے چھن کر کوئی ایک ہزار شعر اور نکلے، اور پھر تیسری چوتھی بار ایک ہزار کے قریب مِلے۔ کمیاب اور نو دریافت نسخوں سے بھی چند شعر ایسے ہاتھ آئے جو ابھی عام نہیں ہوئے ہیں۔ بعض ایسے خیال جو اُوپر سے چلے آرہے تھے، اور اسی لئے زبانوں پر چڑھے، دلوں میں اُترے ہوئے تھے، مگر غالبؔ نے اپنے بُرش سے کوئی رنگ ہلکا یا گہرا کر دیا ہے، لائن سیدھی یا ترچھی کر دی ہے، وہ بھی جگہ پا گئے، مگر وہ جن میں لفظ کی آوازوں کا، بندش کا، یا محض شہرتِ عام کا مزا تھا، وہ یہاں نہیں سماتے۔ وہ بھی شریک ہوتے تو ضخامت اب سے دوگنی ہو جاتی مفصل دیباچے کو ٹیکسٹ بک کا رنگ دیا گیا تاکہ غیر مُلکی پڑھنے والوں کو اُس تمام ذخیرے کا ہلکا سا اندازہ ہو جائے جو غالبؔ شناسی کے سلسلے میں قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے۔

اِس انتخاب کو اپنے مکمل اور جامع و مانع ہونے کا دعوا تو نہیں، تاہم شاعر کے اُردو اور فارسی کُلّیات سے (جن میں اب چودہ ہزار سے زیادہ اشعار مِلتے ہیں) یہ بڑی حد تک بے نیاز ضرور کر دیتا ہے اور فارسی اشعار پر ایک گہری نظر ڈالنے سے غالب کا وہ دعوا بھی ثابت ہوتا ہے جو وہ اپنے فارسی کلام کی برتری کے متعلق کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنیسویں ۱۹ صدی میں فارسی جیسی پھیلی ہوئی، نفیس و شیریں زبان نے غالب دہلوی سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔

نیّت یہ تھی کہ فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کے موقع پر یہ اِنتخاب شائع ہو جائے۔ کِتابت کی کمزوریوں اور بیچ سفر میں راہوار بدلنے کی مجبوریوں نے ایسا نہیں ہونے دیا بہر حال خوشنویس نورالدین آزاد کی ہُنرمندی اور لیڈرز پریس کی فیّاضی سے اَب کہیں تین برس بعد سوکھے دھانوں پانی پڑا ہے اور کوشِش کی گئی ہے کہ چار خوشنویسوں (عبدالسلام، سلامت رضوی، شمیم اعظم، اور محمد قاسم) کے قلموں کے باوجود، کتابت کی غلطیاں باقی نہ رہیں۔

ترتیب کی کیفیت یہ ہے کہ رَدیف کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اوّل چھپے ہوئے کُلّیات سے، اور پھر دوسرے مجموعوں سے، خطوں سے (ان کی اشاعت کا زمانہ دیکھتے ہوئے) ردیف وار شعر چُن دیے گئے ہیں۔ اِملا میں بھی نئے اور پُرانے کا امتیاز مدِّنظر رہا ہے۔

میں اشاعت کی تیاریوں سے کوئی سات ہزار کلومیٹر دور بیٹھا ہوں، پچھلے ڈیڑھ سال میں جو نئے مضامین غالب پر آئے ہوں گے، جو نئی تصانیف نکلی ہوں گی، جو نئے اشعار یا نکتے دریافت ہوئے ہوں گے، اگر وہ ہاتھ آتے تو اُن کا ذکر بھی دیباچے میں ہو جاتا۔ بہر حال اِتنا ضرور ہے کہ یہ دیباچہ (جو ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے) پچھلے سَو برس کی غالب شناسی کے اہم نکات کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے اور جو کچھ مجھے اپنی طرف سے کہنا یا جتانا تھا، وہ بھی مختصر لفظوں میں کہہ دیا ہے۔

اَب غالب شناسی کے سلسلے کی تین کِتابیں میری طرف بقایا ہیں، مونوگراف، مجموعۂ مضامین، بعض اشعار کی وضاحت کے ساتھ مثنوی کے فن اور خود غالب کی مثنویوں پر ایک مجلّد۔ ان کی اشاعت کی باری بھی آئے گی۔ پہلے یہ دیکھ لیں کہ اس اِنتخاب سے "کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا" یا وہ بھی نہیں نکلا۔

ظ انصاری

(انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز۔ آرمیانسکی نمبر ۲۔ ماسکو)

1970

ہدیۂ انتساب

○

امیر الجامعۃ السیفیۃ (سورت)

ڈاکٹر یوسف نجم الدین صاحب

جن کی صحت و سلامتی
دنیا کے بہت سے علمی اور عملی کاموں کیلئے
صحت و سلامتی کی ایک خاموش ضمانت ہے

○

دگرست آں کہ کند سیرِ چمن مثلِ نسیم
واں کہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگرست

ط۔ انصاری

غالب شناسی کے زینے

مرزا غالبؔ نے سوچا فارسی میں، لکھا بھی زیادہ تر فارسی میں (اشعار کی تعداد گیارہ ہزار تین سو کچھ) زبانوں پر چڑھے اردو میں ——— (ان کے تقریباً دو سو اشعار خاص و عام کی روزمرّہ گفتگو کا حصّہ بن چکے ہیں۔) لیکن ان کی قدر ہوئی انگریزی پڑھے لکھوں کی بدولت یا مغربی ادبیات کا ذوق رکھنے والوں کے دم سے۔

غالبؔ اپنی زندگی میں بھی مقبول تھے، تاہم یہ مقبولیت ایک محدود حلقے تک رہی، خاص طور سے ان تعلیم یافتہ لوگوں تک جو فارسی ادبیات پر نظر رکھتے تھے۔ ان کا اردو دیوان بائیس برس میں پانچ بار چھپ چکا تھا۔ یہ حیثیت غالبؔ کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ فارسی دیوان جو اردو سے تقریباً چھ گنا ہے، زندگی میں دو بار شائع ہوا، اور پچھلے سو سال میں صرف پانچ اشاعتوں تک پہنچا ہے جن میں تین اڈیشن پچھلے سال مختلف مقامات سے نکلے ہیں۔ اردو دیوان اور انتخابات کی سَو سے زیادہ اشاعتیں نکل چکی ہیں۔

کیا راز ہے کہ غالبؔ کی قدر ان کے مرنے کے بعد زیادہ ہوئی؟

اسی سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی شاعری اور شخصیت کا وہ کون سا پہلو ہے جو عہدِ حاضر کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟

غالبؔ پر قلم اٹھانے والے قابلِ ذکر اہلِ نظر نے اپنے اپنے طور پر اس سوال کے جواب دیے اور وہ جواب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، غالبؔ کی تلاش میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

غالبؔ کی ان دریافت شدہ خصوصیات کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ نظر میں رکھنا چاہیے کہ کوئی فنکار جو اپنی

زندگی کے بعد بھی جیتا ہے، محض ایک انگی (One sided) صفات سے نہیں جیتا۔ گہرائی کے سوا حُسن، اور حُسن کے سوا کوئی نہ کوئی نیا پن بھی ضرور ہوتا ہے اس کے پاس۔ یہ نیا پن ممکن ہے فنکار کے اپنے زمانے میں نمایاں رہا ہو، لیکن وہ زمانہ، ایک خاص تاریخی یا سماجی دَور گزر جانے کے ساتھ بے حیثیت ہو جائے، پُرانے پن میں شمار ہونے لگے۔ اور ممکن ہے ایک خاص دَور کے اندر کچھ اہم نہ ہو، وہ دَور گزر جانے کے بعد اہم ہو جائے۔

> غالب کے ہاں جن خصوصیات کی قدر بعد میں ہوئی اور جنھیں ہم اس کے پورے شاعرانہ وجود میں اُبھرا ہوا دیکھتے ہیں وہ پُرانے اور نئے پن کا امتزاج ہیں۔ پُرانے ذخیرے کی بہترین روایات سے غالب نے قطعی طور پر رشتہ نہیں توڑا بلکہ ان کا رس اپنے ہاں جذب کر کے، ان پر نئے ذہن، فکر اور فن کے لب و لہجہ کا اضافہ کیا۔ وہ دونوں لحاظ سے اہم ہیں: ان کی فکر میں فارسی اور اُردو، ادبیات کی بہترین لفظی اور معنوی روایات کے عناصر چھن کر، صاف ہو کر اس طرح آئے ہیں کہ ان میں سوچ کا سامان بھی اتنا ہی ہے جتنا لفظوں اور آوازوں سے لُطف اندوز ہونے کا امکان۔ یہ صفات الگ الگ شخصیتوں میں بکھری یا پھیلی ہوئی تھیں۔ غالب کے ہاں وہ یکجا ہو گئیں اور اس طرح وہ قدیم و جدید کا سنگم بن گئے، اسی میں ان کا کمال پوشیدہ ہے۔

غالب کے معاصرین میں، جو ان سے قریب رہے اور جن کی رائے کو ہم عصر تنقید میں جگہ دی جا سکتی ہے، تین نام اہم ہیں: حالی، شیفتہ، اور میر مہدی مجروح۔

حالی نے غالب کے کمال کا راز ان صفات میں پایا ہے: تازگیِ بیان، جدّتِ ادا، شگفتگی اور معنوی تہ داری یہ بات کہ مرزا نے اپنے بیان کو اوروں سے الگ کیا، معمولی سے خیال کو اچھوتے انداز سے بیان کیا، ان کے ہاں طنز یہ مسکراہٹ اور چھیڑ خانی پائی جاتی ہے اور ایک شعر پہلو بدل بدل کر مختلف معانی رکھتا ہے، حالی نے ہم کو بتائی۔

(یادگارِ غالبؔ ص ۱۳۰۔ ۱۰۵)۔

شیفتہؔ کی ادبی کسوٹی پر غالبؔ کا رنگ بہت کھرا ہے، وہ معانی کی نزاکت اور بیان کی متانت کو میزان بناتے ہیں اور میرؔ کے بعد مومنؔ اور غالبؔ کو سب سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں۔

مجروحؔ نے نیازمندانہ تقریظ میں (جو فارسی دیوان اشاعت اوّل کے آخر میں شائع ہوئی) غالبؔ کی اس خصوصیت کو ابھارا ہے کہ ؎

براوجِ خرد ماہِ نو تافتہ
ریاضِ سخن سروِ نو یافتہ

(عقل کی بلندی پر نیا چاند چمکا ہے، اور شاعری کے باغ میں نیا سرو اُگ آیا ہے۔)

سرسیّد احمد نے بھی غالبؔ کے کلام کی خوب تعریف کی ہے (آثار الصّنادید، باب چہارم)، لیکن اس بیان سے کسی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا، اس لیے ہم ان کی رائے کو ادبی تنقید میں شمار نہیں کریں گے۔

غالبؔ کو عظیم شاعر کی حیثیت سے حالیؔ نے روشناس کیا، لیکن اس کے کمال کی نشاندہی اقبالؔ نے کی تھی، جو خود، کئی وجہوں سے غالبؔ کے وارث سمجھے جاتے ہیں۔ اقبالؔ نے غالبؔ کے ”لطفِ گویائی“ میں تخیّل رسا اور ”فکرِ کامل“، کی ہم نشینی دریافت کی ہے اور یقیناً غالبؔ شناسی میں یہ ایک اہم نکتہ بلکہ اضافہ ہے:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی زمانے میں غالبؔ کو اپنے بہترین نقیب میسّر آئے۔ یہی زمانہ متحدہ

ہندستان میں قومی آزادی کی تحریک کا عنفوانِ شباب سمجھنا چاہیئے۔ عبدالرحمان بجنوری نے غاؔلب کو فکر و فن کا ایسا بے مثل ہیرو بنا کر پیش کیا جسے پندرہ ۱۵ مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد اس کی "تشکیک کامل" پر تان توڑی اور بتایا کہ غاؔلب کی شاعری میں خود فلسفیانہ دریافت اور تلاش کے علاوہ مصوّری اور موسیقی کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔ (محاسن کلام غاؔلب)

ڈاکٹر عبداللطیف نے جہاں غاؔلب کے ذاتی کردار کے جھول نمایاں کیے اور اسے زَر پرستی کا شکار بتایا، وہیں دیوان غاؔلب کی تاریخی ترتیب کا آغاز کر کے یہ خصوصیت بھی ظاہر کی کہ لفظی صنعت گری میں غاؔلب کا مقام دوسرے اردو شعرا سے بلند ہے اور اس کے تمام کلام میں گہری فکر کے عناصر بکھرے ہوئے ہیں۔ (Ghalib. Hyderabad 1924)

اسی زمانے میں غاؔلب کے نظامی اڈیشن پر ڈاکٹر سیّد محمود کے دیباچے نے غاؔلب کو ہندستان کی قومی آزادی کا فکری نقیب قرار دیا اور مولانا ابوالکلام آزاؔد نے بعض اطلاعات بڑھا کر اور ان پر تبصرہ کر کے، غاؔلب کے اشعار سے جابجا حوالے دے کر عملی طور سے یہ ثابت کیا کہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں میں بھی غاؔلب کی شاعری کارآمد نکلتی ہے۔ غاؔلب کو انھوں نے مزاجِ شاعری کے اعتبار سے عہدِ جدید (بیسویں صدی) کا شاعر ٹھہرایا۔ (ص ۳۲، غاؔلب اور ابوالکلام۔ غالب اکاڈمی)

حسرؔت موہانی اور نیاؔز فتح پوری بھی مولانا آزاؔد کی سی نگاہ اور آزادانہ فکری رجحان کے بزرگ تھے۔ غاؔلب کو نئی روشنی کی لہروں پر رَواں کرنے اور جدید تعلیم یافتہ حلقے میں پھیلانے کا ادبی فرض انجام دیتے وقت ان دونوں اہلِ قلم نے اسے جدّت، اختراع، آزادانہ فکر اور زندہ دلی کا شاعر قرار دیا۔ نیاؔز نے اس کے ہاں "تفاؤل و مسرت" کا فلسفہ دریافت کیا اور اسی ضمن میں یہ بھی بتایا: "... غاؔلب کی شاعری دراصل معنی آفرینی اور ندرتِ تعبیر و خیال کی شاعری تھی، لیکن وہ زندہ ہے دراصل اپنی زبان کی شاعری سے ___ جس کی مثالیں اس کے اُردو کلام سے بھی کافی مل سکتی ہیں" ___ ("غاؔلب کا آہنگ" نیاؔز۔ لکھنؤ) اگر ڈاکٹر لطیف نے غاؔلب کے خطوط اور اشعار سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے ہاں دنیاوی آسائش، مرتبے اور عزت کی کمی کا رونا بہت ہے جس سے کردار کی کمزوری ٹپکتی ہے اور بڑی شاعری کی صلاحیت برباد ہوتی ہے۔ تو غلام رسول مہؔر نے غاؔلب کو ہر ایک عیب سے پاک کر کے وَلی اللہ ثابت کر دیا۔ مہؔر نے زیادہ تر

اسلامی مجاہدوں کے تذکرے لکھے ہیں۔ غالبؔ کو بھی وہ خدا رسیدہ بزرگ بنا کر پیش کرتے ہیں، تاہم شاعری سے قطع نظر غالبؔ کی نثر، خاص کر خطوط کو وہ اہمیت دی جس کے بغیر شاعر کی عظمت ظاہر نہ ہوتی۔

غالبؔ کی حیات کے علاوہ ان کے فکری رجحانات اور فنکارانہ نظریات کو سمجھنے میں مولوی مہیش پرشاد نے "خطوط" کی اہمیت دریافت کی اور برسوں اس پر کام بھی کیا، لیکن نواب امداد امام اثرؔ کی "کاشف الحقائق" نے فنکار کے ذہن کا سراغ لگانے میں خطوط اور شاعری دونوں سے یکساں کام لیا، دوسروں پر راہ کھولی۔

افراط و تفریط سے ہٹ کر شخصیت کی دریافت کے جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر جس شخص نے غالبؔ کی حیات اور شاعری کے رموز تلاش کیے وہ شیخ محمد اکرام ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اور قیام کے بعد اس علاقے میں غالبؔ پر مہرؔ اور اکرام سے زیادہ کسی نے کام نہیں کیا۔ دونوں کا انداز نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اکرام نے غالبؔ کی خصوصیات کا سراغ لگانے میں یہ واضح کیا کہ شاعر نے کتاب فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ذہن کو قدیم کی تقلید سے آزاد کرانے میں عقلیت پر زور دیتا ہے اور "غالبؔ کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے... یہ حزن و افسردگی اس آدمی کی ہے جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور جسے اس سے محروم رہنا ناگوار ہے۔" (غالبؔ نامہ ص ۳۱۰) غالبؔ کی عقلیت کو Rationalism سے تعبیر کرنے اور اس کی صحت اور برتری دکھانے میں اکرام نے صوفی شعرا، خاص کر اقبالؔ سے اختلاف کیا ہے اور غالبؔ کی تائید کی ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور قاضی عبدالودود، غالبیات کے سلسلے میں ہندستان کے سب سے اہم نام ہیں، لیکن انھوں نے غالبؔ سے متعلق واقعات کی تصدیق اور تفصیل پر کام کیا ہے، غالبؔ کے فن و فکر کی تلاش پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مولانا عرشی اور مالک رام، دونوں کے نزدیک غالبؔ کی دین اس کی نظم و نثر میں یکساں ہے اور دونوں میں ندرت خیال، معنی آفرینی اور جدت ادا سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ قاضی ودود اسے اردو شعرا میں باکمال علمی اعتبار سے ناقص، اچھا نثر نگار اور شگفتہ مزاج آدمی شمار کرتے ہیں۔ ("علم وفن" ڈائجسٹ۔ دہلی)

دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے فوراً بعد غالب کی مقبولیت اور بڑھی۔ یورپی ادبیات اور ذہنی تحریکوں سے باخبر اہل قلم اس طرف متوجہ ہوئے۔

نواب اثر لکھنوی نے "مطالعۂ غالب" میں یہ ثابت کیا کہ غالب کے ہاں غزل کی روایت سے انحراف ہے، سوز و گداز کی کمی ہے، اردو کے دوسرے شعرا خصوصاً میر کے خیالات کو لہجہ بدل کر لکھتے ہیں اور ان کے فلسفیانہ بیانات میں تضاد ہے، عشق میں بھی اپنی جان اور اپنی آبرو ان کو عزیز ہے۔ پروفیسر شوکت سبزواری نے غالب کے فلسفۂ حیات و موت، غم و نشاط، عشق و عقل پر قرآن و گیتا کے علاوہ مغربی فلسفے سے بھی روشنی ڈالی۔ (فلسفۂ غالب) اور نتیجہ نکالا:

"... ان کی شخصیت کی عظمت کا راز... غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں۔ ان کی شخصیت فعلی ہے۔ انفعال غالب کے نزدیک "ہنگامۂ زبونیِ ہمت" ہے... غالب خود بیں، خود پسند اور آزاد منش ہیں۔ خود بینی سے عزتِ نفس، خود پسندی سے غیرت اور آزاد منشی سے خودداری پیدا ہوتی ہے... غالب کے کلام میں یہ تمام جوہر ہیں"۔ (ص ۲۵۳۔ غالب فکر و فن۔ کراچی)

احتشام حسین، آل احمد سرور اور فیض احمد فیض نے ایک قیمتی مضمون کے ذریعے غالب کے فکر و فن کے نمایاں اوصاف معلوم کیے۔ پروفیسر احتشام نے غالب کی جدیدیت کا سماجی پس منظر تلاش کرتے ہوئے یہ جتایا کہ دہلی سے کلکتے کا سفر، جدید ماحول اور ذہنی تحریکوں سے شاعر کی آگاہی اس کے خیالات تبدیل کرنے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مستقبل کی جانب آنکھیں کھلی رکھنے اور قدیم کی فرسودگی سے اکتا جانے کی بدولت غالب کی شاعری اور نثر میں نئے عہد کا مزاج پیدا ہوا ہے۔ آل احمد سرور نے ایک عالمانہ اور شگفتہ تجزیے کے ذریعے بتایا کہ غالب اپنے سے پہلے کے اور موجودہ مسلمات اور نظریوں کو، جوں کا توں، قبول نہیں کرتا بلکہ ہر ایک ضابطے اور عقیدے پر سوالیہ علامت لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک "صحت مند تشکیک" ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں میں کھو نہیں جاتا بلکہ دونوں کی حقیقت پر ایک تیسرے آدمی کی طرح غور کرتا ہے اور یہی تشکیک اس کے کلام کو تازہ دم رکھتی ہے۔ فیض نے غالب کی پریشاں حالی کے پردے میں ایک واضح اور نمایاں وحدت، "تلاش کی اور اسے ایک ایسی" اداسی" سے تعبیر کیا جو کسی فرد کے ذاتی غم کے بجائے ایک نسل یا دور کی اجتماعی ذہنی کیفیت ہے۔ اس میں ماضی کی یاد، حال کی بے کیفی اور مستقبل کی امید و ناامیدی کی کشمکش شامل ہے۔

مجنوںؔ اور فراقؔ گورکھپوری نے غالبؔ کی امتیازی خصوصیت رمز و کنایہ، طنز، خودداری اور خود شناسی کو قرار دیا ہے۔ (نکاتِ مجنوںؔ ۱۹۲۔ حاشیے ۸۴۔ علم و فن ڈائجسٹ۔ انٹرویو) فراقؔ نے ادب کے طالب علموں کو یہ جتا کر احسان کیا کہ غالبؔ کے ہاں عشقیہ شاعری بہت کم ہے اور دُنیا کی بڑی شاعری میں عشقیہ حصّے کم ہی شامل ہیں۔ ان دونوں فاضل تنقید نگاروں کو اتفاق ہے کہ "غالبؔ کے تغزّل اور تصوّف دونوں کو دل سے کہیں زیادہ دماغ سے تعلق ہے" (ص ۴۲۔ نکات) غالبؔ کے عشق میں سپردگی نہیں، طنز کا لہجہ اور لیے دیے رہنے کی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے مختلف خطبوں میں غالبؔ کی بعض خصوصیات پر زور دیا ہے، وہ "فکر کے عنصر، شخصیت کی انفرادیت" اور الفاظ کی خاص طرح کی بندش کو شاعر کا کمال قرار دیتے ہیں۔

"... جن اشعار میں فکر کا عنصر نہیں، وہاں بھی آہنگ اور لہجہ اور الفاظ کی بندش سے شعر پُر فن ہو گیا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی شخصیت کی انفرادیت ان کے اسلوب کی ندرت بن گئی تھی..." (افتتاحیہ خطبہ، غالبؔ اکاڈمی دہلی)

> قریب قریب آدھی صدی غالبؔ کا سنجیدہ مطالعہ ہو چکنے کے بعد اردو ادب کے جانکاروں میں اب یہ بات بدیہی سمجھی جاتی ہے کہ غالبؔ عہدِ حاضر کے مزاج کا شاعر ہے، اس کے ہاں گہرا تفکر رواں دواں ہے، اس کا لہجہ مردانہ ہے، وہ عشق کے معاملات میں بھی خودداری سکھاتا ہے۔ اس کے آہنگ پر فارسی کے کلاسیکی لب و لہجہ کا اثر ہے۔ وہ ذہنی فرسودگی سے نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیان کی شوخی محض ظرافت نہیں بلکہ بامعنی اور گہرا طنز ہے ایک ایسے وجود کا، جو خود کسی اعتقاد یا نظریے کا پوری طرح پابند نہیں۔

پچھلے دس پندرہ برسوں میں غالبؔ شناسی نے اس مقام سے آگے قدم اٹھایا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے فلسفے کے گہرے مطالعے اور فارسی ادبیات پر وسیع نظر رکھنے کے علاوہ، غالبؔ کی حکمت اور شاعری کو اقبالؔ کی ہم نشینی سے بھی حاصل کیا۔ انھوں نے رہنمائی کی کہ "برگزیدہ اشعار کی تعداد فارسی کے کلام میں بہ نسبت اُردو مجموعۂ اشعار کے کہیں زیادہ ہے...

اس کا فارسی کلام فن کے لحاظ سے اردو کلام کی بہ نسبت بہت سُلجھا ہوا ہے" اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ "غالب نے فارسی شاعری اردو کے بہت بعد شروع کی اور ایسے اساتذہ کے نمونے اپنے سامنے رکھے جن کے کلام میں سلاست اور لطافت تھی"۔ (افکارِ غالب ص ۲۰۔۱۹) انھوں نے غالب کے فارسی کلام میں "برگزیدہ اشعار کی تشریح کی اور اس نکتے پر زور دیا کہ غالب کے کلام میں لامتناہی کی تمنا کسی محدود شے سے مطمئن نہیں ہوتی اور اس طرح حرکت و حیات کا سبب بنتی ہے۔ غالب کے اہم فارسی اشعار کی وضاحت اور تفسیر کر کے انھوں نے غالب کی مقبولیت کا ایک اور باب کھول دیا۔

میکش اکبر آبادی نے، کہ خود بھی خاندانِ صوفیا کے باقیات سے ہیں، غالب کو علم اور عقیدے کے اعتبار سے صوفی قرار دینے کے بعد اپنے مختلف مضامین سے ثابت کیا کہ وجود و عدم اور حیات و موت کی حقیقت دریافت کرنے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریہ "الحق محسوس والخلق معقول" سے بھی ہٹ گئے، اور شنکراچاریہ کے ویدانت کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ تصوّف اور ویدانت کے اصول جہاں ہم زبان ہو جاتے ہیں، غالب وہاں ٹھہر کر آگے نکل تو گئے، لیکن محسوسات کے حُسن سے بے نیاز نہیں ہو سکے۔ یہ بھی ان کی شاعری کا ایک دِل کش پہلو ہے۔

ممتاز حسین نے مارکسی تعلیمات کی روشنی میں غالب کے 'میں' اور 'ہم' کی تشریح کی اور بتایا کہ غالب نے غزل کی رمزی یا ایمائی زبان میں ذاتی تجربات کو عمومی شکل (Impersonal) دی ہے اور عصری جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وحدت الوجود کے نظریے کی مدد سے یہ سمجھا کہ "کائنات اپنی ذات (Essence) میں ایک ہے اور اپنی صفات (Attributes) میں کثرت پذیر ہے۔ تمام عالم فطرت ایکائی ہے اور ترغیبات یا خواہشات جو زندگی کا سرچشمہ ہیں، نہ ان سے بے پروائی یا تیاگ میں نجات ہے، نہ بے لگام چھوڑ دینے میں ـــــ ضرورت ہے ایسی فطرت پرستی کی جس میں انسانی ہمدردی شامل ہو یعنی Humanized paganism غالب کی حسن پسندی میں سردار جعفری نے بھی اسی پہلو پر زور دیا ہے۔ (دیباچہ دیوان غالب) ممتاز حسین نے اپنی تازہ تصنیف "غالب کا فن" میں اسی تلاش کو اور آگے بڑھایا ہے اور زندگی کے خارجی واقعات کا عالمانہ تجزیہ کر کے ہمیں ان رشتوں کے سمجھنے میں مدد دی ہے جو شاعر کے فکری اور فنی محرکات میں پوشیدہ ہیں۔

خورشید الاسلام نے **غالب** کا مطالعہ ہندستان کے فارسی شعرا، اور کلاسیکی اُردو ادب کے پس منظر میں کیا اور ثبوت کے ساتھ دکھایا کہ **غالب** کے ہاں تصوّف نمایاں ہے لیکن ساتھ ہی "مادیت یا حقیقت پسندی کا بھی ایک رجحان ملتا ہے جو تصوّف کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے۔" (غالب۔ علی گڑھ ۱۹۶۰ء) نوجوانی میں ہی **غالب** کے ہاں ایک آفاقی انداز ہے۔ اور یہی انداز ہمارے دلوں کے دامن کھینچتا ہے۔ **غالب** کا تنگیِ کائنات کا شکوہ، دراصل اپنے حق کا مطالبہ ہے اور یہ حق اس کو پہنچتا ہے جس کے حوصلے قوی، آرزوئیں تازہ اور شوق بے پایاں ہوں۔ **غالب** کے شاعرانہ کمال کی دریافت میں **شیخ اکرام** کے پچیس سال بعد **موسیٰ خاں کلیم** دوسرے آدمی ہیں جنھوں نے نفسیات کی پوری مدد لی ہے۔ شخصیت کی تینوں سطحوں، شعور، تحت الشعور اور لاشعور کو ایک رشتے میں پرو کر یہ جتایا کہ **غالب** کی اکثر غزلوں میں باطنی یا معنوی وحدت اور مضمون یا خیال کا رُبط پایا جاتا ہے۔ (مقام غالب ص ۲۱۰ - ۲۴۰) **غالب** کے وجدان میں دماغ شریک ہے، وہ شعوری فنکار ہے اور قلبی کیفیت کے بیان کرنے میں خرد تخیلی (Imaginative reason) سے کام لیتا ہے۔ یہی صفت اسے فارسی اردو شعرا میں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے خاص طور سے **غالب** کے آہنگ کو اپنا موضوع بنایا اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ **غالب** کو صرف اس عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے —— ایک سے حالات کے دو شاعر دو الگ جذباتی دنیائیں رکھ سکتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ **غالب** کی "تخیلی فکر منطقی اور تخیلی فکر کے برخلاف ان کے وجدان سے سیراب ہوتی ہے... ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ... اپنے تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچا دیا" —— (غالب اور آہنگ غالب۔ دسمبر ۱۹۶۸ء دہلی) انھوں نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں انھیں خصوصیات کو بلا ترتیب جمع کر دیا ہے، جو آج تک لکھی جا چکی تھیں لیکن "تیکھے مردانہ پن کو موسیقی میں رچانے" کا دعوا بے دلیل جانے دیا۔ **غالب** کے آہنگ پر **ڈاکٹر مسعود حسین خاں** نے البتہ روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ خود صوتی آہنگ میں شاعر بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ بحروں اور الفاظ و علامات کے چناؤ میں **غالب** کو جذبے کی نوعیت سے تال میل مدنظر ہے۔

نیاز فتح پوری نے **غالب** کے ہاں اس نکتے پر زور دیا تھا کہ اچھی غزلوں میں، اگر غور سے دیکھا جائے تو

کوئی نہ کوئی ایک مصرعہ ضرور ایسا پایا جاتا ہے جو غالباً سب سے پہلے ذہن میں آیا اور اسی نے پوری غزل کی تحریک کی۔ اس مکمل مصرعے، محاورے یا لفظ و ترکیب میں خاص قسم کا آہنگ ہوتا ہے جو غالب کی نظر میں چڑھ جاتا ہے اور پھر اسی آہنگ کے سانچے میں غزل ڈھلتی ہے۔ (سالنامہ نگار۔ جنوری ۱۹۶۱ء) **مسعود حسین خاں** نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ **غالب** اپنی غزل کے موڈ کے مطابق حروف اور آوازیں چنتے ہیں۔ مثلاً وہ غزل ... "درد سے بھر نہ آئے کیوں ... کوئی ہمیں ستائے کیوں" نو شعروں میں شاعر نے ۴۱ بار نون استعمال کیا ہے۔ (Nasalized vowels) کے ذریعے غنائیت اور غمگین موسیقی پیدا کی ہے ... "ستائے نہ بنے ... بنائے نہ بنے" قافیہ ردیف کی غزل میں نون (ن) ۵۱ بار استعمال ہوا، اس میں نون غنہ بھی ہے اور نون منقوطہ بھی ـــــ جس کی تکرار سے خاص طرح کی آوازیں پیدا ہوئی ہیں اور پوری غزل میں درد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک نئی بات موصوف نے یہ بتائی کہ غالب کے منتخب دیوان میں جو دو درجن اعلا درجے کی غزلیں ہیں ان میں ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ وغیرہ ثقیل آوازوں سے پرہیز کیا ہے تاکہ آہنگ میں سختی و کرختگی پیدا نہ ہونے پائے۔ ("غالب کا صوتی آہنگ" مقالہ، سمینار، دہلی۔ فروری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر مغنی تبسم نے لسانیات (Linguistics) کے اصولوں سے جانچ کر یہ دکھایا ہے کہ **غالب** نے اوزان کے آہنگ سے بڑا کام لیا ہے اور "اکثر صورتوں میں اپنے لہجے کو وزن کے مقررہ آہنگ پر حاوی کر دیا ہے"۔ (شاعر، غالب نمبر ۱۹۶۹ء۔ بمبئی)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے انگریزی کی رومانوی اور جدید شاعری پر تنقیدی ادبیات کی نظر سے **غالب** کی خصوصیات کا پتہ لگایا اور توجہ دلائی کہ **ولیم بلیک** (William Blake) کی شاعری کی طرح "نگاہ" کو یہاں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے ـــــ **غالب** اپنے نفسیاتی تجربوں، جذبوں اور تخیلی کیفیتوں کو ایسی جسمانی علامتوں کے ذریعے ابھارتا ہے جن میں رنگ، حرکت، بیتابی اور مقناطیسی صفت پائی جاتی ہے۔ مثالی پیکروں کے ذریعے اس نے مبہم جذبے اور مجسم وجود کا تعلق پیدا کر دیا ہے۔ وہ جب ایک بے پردہ جسمانی تجربے کو بھی بیان کرتا ہے تو اس طرح کہ خیال ان حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے اور تخیل کو مہمیز لگتی ہے۔ غالب کے شاعرانہ کمال کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ہماری آنکھوں

اور کانوں کو بیک وقت متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ ایسے رنگ چن دیتا ہے جو بے ارادہ ہماری نظر کھینچ لیتے ہیں اور پھر "آتشِ چشم و گوش" سے واضح اور بے قرار تصویریں منظرِ تصور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ (مقالہ سیمینار دہلی۔ فروری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر محمد حسن نے مختلف موقعوں پر غالبؔ کی شاعرانہ صفات کا جائزہ لیا ہے۔ تازہ ترین جستجو میں انھوں نے غالبؔ کو "نئی داخلیت کی آواز" قرار دیا۔ کہا کہ اس کا "جذبہ روایتی کے بجائے انفرادی ہے... اس نے اردو شاعری کو صرف سوچنے کی قوت نہیں بخشی بلکہ شکستوں اور ناکامیوں سے بلند ہوکر زندگی گزارنے کا موقع دیا... ابدی جستجو غالبؔ کا سب سے عظیم ورثہ ہے... وہ جس طرح نئی نسل کی افسردگی، تشکیک، کلبیّت اور شکست خوردگی میں شریک ہوتے اور سہارا دیتے ہیں اس طرح اردو کا کوئی دوسرا شاعر شریک نہیں ہوتا..." (فروغِ اردو، لکھنؤ۔ غالبؔ نمبر ۱۹۶۹ء)

پروفیسر محمد مجیب نے غالبؔ کے کلام کے فکری پہلو یا فلسفیانہ آہنگ کا تانا بانا معلوم کرکے بتایا تھا کہ نوفلاطونی فلسفے، ایرانی تصوف اور ہندستانی ویدانت کے باریک تار اس شاعر کی انسانیت دوست نگاہ کے تار سے مل گئے ہیں اور خوش بیانی نے انھیں سننے یا پڑھنے والوں کے لیے دل کش بنا دیا۔ پروفیسر سرورؔ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ جدیدیت (Modernity) سے غالبؔ کا یہ گہرا رشتہ ہے کہ اس کی شاعری شروع دَور سے ہی، سننے کے بجائے پڑھنے کی چیز ہے، دوسرے وہ کسی نظریے یا فلسفے کی پابند نہیں۔ تیسرے یہ کہ غور طلب ہے اور سوچنے پر اُکساتے وقت وہ اپنی عظمت کا سکّہ جماتی ہے۔ (مقالہ سمینار، علی گڑھ۔ مارچ ۱۹۶۹ء) انھی خیالات کی مزید علمی وضاحت ہوتی ہے تین تازہ ترین مقالوں سے: ایک پروفیسر عالم خوندمیری کا بیش قیمت مضمون "غالبؔ کی ابتدائی شاعری، تلاشِ استناد کی ایک کوشش" وہ کہتے ہیں کہ ۲۵ برس کی عمر میں شاعر کو وجود کی ماہیّت کا شاعرانہ وجدان ہوگیا تھا۔ "تنہا غالبؔ ہے جس نے "وحشت" میں وحدت کا راز پایا۔ "غالبؔ کے نزدیک وحشت اور تمنّا یا شوق میں ایک گہرا اندرونی ربط ہے... انھیں کائناتی تمنا کے مقابلے میں موجود کائنات محدود نظر آتی ہے اور اسی لیے وہ کائنات کو وسیع تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے شوق ایک عقیدے سے کم نہ تھا... یہی شوق اور تمنّا ہے جو وجود کے ہر پیکر کو فردیت عطا کرتا ہے۔ فردیت کا یہی شدید احساس غالبؔ کو تنہائی کے اضطراب سے دوچار کرتا ہے اور اس تنہائی کے احساس سے بے چین ہوکر

وہ اپنی شخصیت کو مستند یا authentic بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی پوری شاعری تلاشِ استناد کی ایک داستان ہے ...“ (Urdu Blitz, 1st March 1969) ڈاکٹر وحید اختر بھی عالم خوندمیری کی طرح غالب کی فلسفیانہ جستجو کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب بیسویں صدی کے فکری میلان کے پیش رو اس لیے ہیں کہ مذہب، فلسفہ، سیاست، ادب، آرٹ ہر شعبے میں ان کے ہاں تشکیک ہے۔ ”غالب نے اپنے کو کسی عقیدے، کسی فلسفیانہ نظام یا کسی محدود تصوّر سے وابستہ نہیں کیا“ اس لیے گزشتہ کل کے بعض نظریات اگر آج رد کر دیے جائیں تو غالب اپنی نابستگی (Unconformism) کی بدولت قبول کیے جائیں گے ...“ وہ سب کے ہم نوا ہوتے ہوئے بھی سب سے آزاد ہیں۔“

ڈاکٹر وزیر آغا بھی فلسفہ اور مغربی ادبیات کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی جدید ادبی تنقید کے معیاروں سے غالب کے شاعرانہ اسرار تلاش کیے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنے حالیہ دو مضمونوں میں غالب کی شخصیت کے اندرونی تصادم سے اس کی مقبولیت کا راز معلوم کیا اور اس کے ذوقِ تماشا کو اہمیت دیتے ہوئے بتایا کہ زندگی کے مختلف مظاہر کے لیے غالب ایسا تماشائی ہے جو تماشے میں شریک ہو کر، لطف اندوز ہو کر رائے زنی کرتا ہے اور طنزیہ موڈ میں مسکرا دیتا ہے۔ وہ ہجوم میں رہ کر بھی اس سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ (شاعر۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء۔ بمبئی)

صد سالہ جشن کے ضمن میں غالب شناسوں کے جو نام ابھرے ہیں ان میں پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، خورشید الاسلام، موسیٰ خاں کلیم، آفتاب احمد خاں، افتخار جالب، قدرت نقوی، شکیل الرحمٰن کے علاوہ اطالیہ کے لیکساندر بوسانی، لندن کے رالف رسل اور روس کی نتاشا پری گارینا بھی قابلِ ذکر ہیں۔ فکری نظریات کے اختلاف کے باوجود ان سب کی نظر اردو فارسی ادب کے اس تمام سرمائے پر ہے جو غالب کی آخری خاموشی کے بعد سے اب تک منظر عام پر آ چکا ہے۔

رالف رسل اور خورشید الاسلام کی مشترکہ تالیف ” (Ghalib life and letters) “ اگرچہ محض مستند سوانح مرتب کرنے کی کوشش ہے، تاہم اس میں خطوط اور اشعار کی مدد سے ایک نفسیاتی نکتہ حل کیا گیا ہے :

اپنے اردگرد کے حالات، خواہشات، تمناؤں اور عقیدوں کی تشکیل میں اس شاعر کا برتاؤ بچپن سے ہی "بظاہر آشنا، بباطن بیگانہ" کے سانچے میں ڈھل گیا، عاشقی ہو یا شاعری، دربارداری ہو یا بے تعلقی، ہر عمل میں وہ "باہمہ اور بے ہمہ" رہتا ہے اور اسی برتاؤ کی ڈھال سے زندگی کی ناگواریوں کو گوارا کرلیتا ہے۔ یہ برتاؤ جو ۱۸۵۸ء "دستنبو" شائع کرتے وقت سامنے آیا، دراصل غالب کے بچپن سے ہی اس کے پورے وجود میں رس بس چکا تھا۔

نتاشا پری گاربنا نے چند اہم علامات چن کر غالب اور اقبال کے ہاں ان کے تلازمے تلاش کیے اور یہ حیرانی ظاہر کی کہ اقبال جنہیں فکر و فن میں غالب کا وارث سمجھا جاتا ہے، غالب کے چراغ تمنا و جستجو سے روشنی تو ضرور لیتے ہیں لیکن اس سے ایک معاشرے، ایک محدود دنیا کی تاریکی دھونا چاہتے ہیں، ان کا علم غالب سے کہیں وسیع لیکن تخاطب غالب کے مقابلے میں نہایت محدود ہے۔

غالب کی دین اور اس کے فنکارانہ کمال پر مختلف خیالات رکھنے والوں نے پچھلے سو سال میں جو نکتے بیان کیے ہیں، ان سب سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود، اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک پہلو سامنے آجاتا ہے اور غالب کا مطالعہ کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ غالب کی نظم و نثر کی تمیز پیدا ہوتی ہے بلکہ وسیع پیمانے پر پرانی اور نئی ادبی شناخت میں ذوق کو تربیت اور نگاہ کو وسعت بھی ملتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں زمانے کے مزاج اور مذاق کی تبدیلی کو بہت دخل ہے اور خود شاعر کو اس تبدیلی کا کچھ کچھ احساس تھا۔ اگرچہ اس نے بعض اوقات مایوسی کا اظہار کیا لیکن زمانے کے تعلق سے جو آواز اس کی نظم و نثر پر حاوی ہے وہ استقبال کی ہے۔ وہ آنے والے زمانے کو نہیں کوستا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا ہے، وہ اپنے دکھوں اور اپنے طبقے یا ہم وطنوں کی حالت پر کڑھنے اور طنز کرنے کے باوجود، زمان و مکان سے بے تعلق یا بیزار نہیں ہوتا بلکہ اس کے پوشیدہ امکانات تک نگاہ پہنچاتا ہے۔ اور ہم کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ ایسے دیدہ ور صاحب نظر لوگوں سے رہنمائی حاصل کرو جو پتھر کے سینے میں چھپے ہوئے شرارے دیکھ لیں۔ (قصیدہ ۲۶۵۔ ردیف "بنید") اگر انسان کی نگاہ گہرائیوں میں نہ اتر سکے، حقیقت

کا سراغ نہ پا سکے، تب بھی اس حسنِ فطرت سے منکر نہ ہونا چاہیئے جو آنکھوں کو میسر ہے، ذوق و ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے۔ مختصر سی انسانی زندگی میں آسائش و آرائش کی تلاش گناہ نہیں بلکہ جبر میں اختیار کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ زندگی اور فن کے متعلق غالبؔ تفکر کا قائل ہے۔ علوم میں معقولات (Natural Sciences) کی تحصیل پر زور دیتا ہے، ہر ایک منظر پر آنکھیں کھلی رکھنے اور اس کی تہہ میں اُترنے کو ذہنی آدمی (intellectual) کا فریضہ قرار دیتا ہے، تاہم اس کا نقطہ نظر عملی ہے —— حسن و عشق کے معاملات میں وہ انسانی فطرت کے اس المیے سے آگاہ ہے کہ خواہشوں کی کثرت محرومی کا سبب بنتی ہے اور بُرق کی عبادت کرنے والا ہی پیداوار جل جانے کا افسوس کرتا ہے۔ حیات و موت میں بھی جبر و اختیار کی یہ کش مکش جاری ہے، یہ المیہ، یہ کش مکش، یہ اثبات و نفی کی درمیانی حالت اس کا دل ضرور دُکھاتی ہے لیکن شوق، تمنّا اور کوشش و کاوش سے اُکتاتی نہیں، بلکہ اور اُکساہ پیدا کرتی ہے۔ اگر زندگی اور فن دونوں کے متعلق اس کا برتاؤ عملی اور اس کا اضطراب نتیجہ خیز نہ ہوتا تو اس قسم کے سیکڑوں اشعار اس کے کلام میں اور خطوط میں جا بجا بکھرے نہ ہوتے:

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دِل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے

گر بمعنی نہ رسی، جلوہ صورت چہ کم ست؟
خمِ زلف و شکنِ طَرفِ کلا ہے دریاب

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے!
ترادتِ چمن و خوبیِ ہُوا کہیئے!

یہ عملی نقطہ نظر اس کی نظم و نثر میں چند غیر معمولی خصوصیات اُبھارتا ہے، جنھیں ہم یوں شمار کر سکتے ہیں:

(۱) وہ انتہائی غم اور زبردست نشاط کے لمحوں میں بھی ہوش مندی سے ہاتھ نہیں دھوتا۔ ہر موقع پر لیے دیے رہتا ہے۔ "یک گونہ بےخودی" اس کی پالیسی (Policy) یا وقتی تدبیر ہے، کریڈ (Creed) یا ایمان نہیں۔ کوئی بھی ذہنی یا جذباتی عالم ہو، اپنے اور کائنات کے وجود سے غافل ہو جانا اسے گوارا نہیں۔

رومانوی دور کے شاعروں کی افتادِ طبع کے خلاف وہ نہایت سنبھلا ہوا شاعر ہے۔ کسی کیفیت میں اسے بےقابو ہو جانا پسند نہیں، اپنی شاعری میں [دو تین شعروں کو چھوڑ کر] اور خطوں میں یہ وہ فضا قائم کرتا ہے کہ انسان کو شہد کی نہیں، مصری کی مکھی بننا چاہیے کہ لذّت تو حاصل کرے، اس لذّت میں ڈوب نہ جائے۔ غالب سے زیادہ کھُل کر ۱۹ ویں صدی کے کسی شاعر نے یہ بات نہیں کہی:

در دہر فرو رفتۂ لذّت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد تشنید مگس ما

(دنیا ایسی ہے کہ انسان کو لذّت یا عیش میں ڈوبنا نہیں چاہیے۔ ہماری مکھی شہد پر نہیں مصری پر بیٹھتی ہے)
فنکار کو بھی اس کا کچھ ایسا ہی مشورہ ہے کہ اپنے باطن کو، اپنے فنّ ضمیر کو منظرِ عام پر لاؤ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ قدم ڈگمگا جائیں، اپنی جگہ مضبوطی سے تھامے رہنا "جار انگاہ وار وہم از خود جدا برقص" ادب اور زندگی، دونوں کے بارے میں غالب کی یہ "خودنگری" خودداری، سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ عزّتِ نفس کا ماحول پیدا کرتی ہے۔

(۲) دنیا کے کئی عظیم شاعروں کی طرح غالب کی شاعری بھی ایک تاریخی دَور کا موڑ دکھاتی ہے۔ مختلف لفظوں میں اس نے خود بھی یہ اظہار کیا ہے کہ "کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے" —— زندگی کے حالات اور زندگی کی تمناؤں کا زبردست تصادم اس کے کلام میں دو رنگی دھاریاں ڈالتا ہے۔ اور ایک ایسے رومانوی یا تصوّری ہیرو کا پیکر اُبھارتا ہے جو روزمرّہ کی زندگی سے اوپر اٹھ کر کچھ خواہشوں، تمنّاؤں اور آدرشوں میں زندہ ہے۔ وہ غالب جسے امیروں کے آستانوں پر، شکستہ دربار کی ہلکی پھلکی محفلوں میں، گورنروں کی بارگاہ میں سر جھکا کر قصیدہ یا قطعہ پیش کرنے کی مجبوری درپیش رہی، روزمرّہ کی زندگی کے ہاتھوں بےبس اور موروثی عادات کے شکنجوں میں

جکڑا ہوا غالب ہے، اور وہ جو اپنے طرزِ بیان اور طرزِ فکر میں جدا راہیں تلاش کرتا ہے، ذہنی آزادی کے گُن گاتا ہے، فکر کو تلاش کی راہ پر رواں اور تازہ دم رکھنے کا دعوٰی کرتا ہے، اور اپنے زمانے کی کسی روش سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اس کی تمناؤں یا آدرشوں کا تراشا ہوا پیکر ہے۔ پہلے وجود کو اس کے بزرگوں نے اور گھریلو حالات نے جنم دیا تھا، دوسرے وجود کو خود غالب نے اپنی تلاش اور فکر و فن کی آمیزش سے تراشا ہے۔ غالب کا یہ تصوری وجود بھی اپنے لیے "میں" اور "ہم" کی ضمیر استعمال کرتا ہے اور یہی مرزا اسداللہ کا وہ نعم البدل ہے جسے نسلِ حاضر نے غالب کے کلام سے حاصل کیا۔

(۳) فارسی اردو شاعری کے ایک ہزار سالہ ادبی ورثے میں غالب سے بڑھ کر کسی نے "عقلیت" پر اتنا زور نہیں دیا۔ جرمن فلسفی کانٹ کے "Pure Reason" (عقلِ محض) کی اطلاع غالب کو نہیں تھی، لیکن عقلیت، استدلال، احساسِ تناسب یا غور و فکر کو ہمارا شاعر زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہوئے بھی اُسے جذبات سے عاری قرار نہیں دیتا۔ وہ انسانی عقل کو "اندھیری رات کا چراغ" اور "جذبات کو قابو میں رکھنے والی قوت" ٹھہراتا ہے اور اس کے حصول پر زور دیتا ہے۔

عقلیت پر زور دے کر، جہاں وہ ایک طرف قدیم نظامِ زندگی سے اپنا جذباتی رشتہ توڑنے کا اعلان کرتا ہے، وہیں ایک ایسی زندگی کا طلب گار ہے جس میں انسان سربلند ہو، بستی میں بھوکے ننگے نہ ہوں، تعصب یا تنگ نظری کا ماحول نہ رہے اور آدمی میں عزتِ نفس کا جذبہ قوی ہو۔

غالب پہلا شاعر ہے جس نے خرد، غم اور آرٹ کا پوشیدہ رشتہ تلاش کیا۔ غم وہ گہری اُداسی جو آرزوؤں کی پے در پے شکست سے اور دکھوں بھری دنیا کے ہمدردانہ مشاہدے سے انسانی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ خرد، وہ علم اور تلاش کی قوت جو عالمِ اسباب کے مظاہر (Phenomena) میں اتر کر ان کے امکانات (Perspective) کا پتہ لگاتی ہے، حالات سے نمٹنے کی تدبیریں سجھاتی ہے اور خواہشوں کو قابو میں رکھ کر ان کا تناسب دکھاتی ہے۔ شاعری، موسیقی یا مصوری، انسانی روح کی یہ زبان ـــــ جو آرٹ ہے، خرد اور غم سے مل کر

ایک مثلث بناتی ہے۔ اسی کو فکر اور جذبے کی آمیزش کہا گیا ہے۔ غالب کے آرٹ میں، خود آرٹ کا یہ تصور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ "دلِ دردمند" اور "خرد خوردہ بیں" دونوں اس ترازو میں ہم وزن ہیں۔ غالب کے ہاں Rational کے ساتھ irrational کی بھی اہمیت ہے، غم اگر عشق کا نہ ہوتا تو روزگار کا نہ ہوتا، دل اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا Rationalism روشنی دکھاتا ہے، رہنمائی کرتا ہے، لیکن آگے نہیں لے جاتا، اس کے لیے عشق کی دردمندی چاہیے اور تمناؤں کی وہ بے چینی جو صورتِ حالات میں تھک کر نہیں بیٹھ رہتی۔ آرٹ محض جذبے یا فکر کا اظہار نہیں —— خوب صورت، دل کش اور دلوں میں اتر جانے والا اظہار ہے جو مخاطب کو بھی کہنے والے کی آنچ میں سینک دے اور ذہنی کیفیت میں شریک کرے۔

آرٹ میں بھی اس کی "عقلیت" اپنا کام کرتی ہے اور اسے لفظوں کے حسن و کشش میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ وہ خوب صورت لفظوں کے طلسم میں گرفتار نہیں ہوتا، لفظوں اور بندشوں کو اوزار کی طرح قابو میں رکھتا ہے اور حسبِ منشا کام لیتا ہے۔

(۴) غالب نے اپنے زمانے میں رائج تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ معاصرین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تصوف کے مختلف نظریوں، اصطلاحوں اور مسائل پر غالب کی بہت گہری نظر تھی، وہ عمر اور علم کے مختلف مرحلوں میں موت و حیات، جبر و اختیار، خالق اور مخلوق کے بارے میں اپنی رائے بھی بدلتا رہا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس مقام پر آکر ٹھہرا جہاں تصوف ایک مابعد الطبیعیاتی (metaphysical) عقیدہ بننے کے بجائے ایک اخلاقی برتاؤ رہ جاتا ہے۔ اس نے تصوف کے مسائل میں سے، انسانی روح کا درد، تمام موجودات کی حقیقت کا ایک ہونا، مایوسی یا بیزاری کو صبر و رضا سے بدل دینا، تمام انسانوں کو ایک برادری شمار کرنا، اپنے اور غیر، خالق و مخلوق کے درمیان فرق اٹھا دینا اور مذاہب کے اختلافات سے، نفرت و حقارت سے ہاتھ دھو لینا، اپنے لیے انتخاب کر لیا۔ تصوف کو غالب نے اس کی نیم فلسفیانہ بحثوں اور مقررہ رسموں (Rituals) سے نکال کر اپنا ایک اخلاقی بیوہار بنا لیا اور وحدۃ الوجود کے نظریوں کو نقاب کی طرح نہیں بلکہ چھتری کے طور پر استعمال کیا، ورنہ شعروں اور خطوں میں یہ خیال بار بار کیوں آتا ہے:

بر آر از بزمِ بحث اے جذبۂ توحید غاؔلب را
کہ تُرکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمی آید

(۵) تصوّف کی جس روح کو شاعر نے اپنایا 'وہ مخلوق کو خالق کا پرتو مان کر بھی فرد کی قدر و قیمت سے آگاہ ہے' یہاں بھی اسی قسم کا تضاد نظر آتا ہے جیسا دنیا کے روپ کو بے حقیقت سمجھنے کے بعد اس روپ سے دل لگانے کی کوشش یا خواہش۔ فرد کی حیثیت اور اس کی سربلندی غاؔلب کی شاعری میں پوری طرح ابھر کر آتی ہے اور انسان کی عظمت کا ترانہ بن جاتی ہے۔ وہ انسان کو پوری کائنات کے دائرے کا مرکزی نقطہ سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ دنیا کی رونق انسان کے دم سے ہے۔ مٹی کی یہی مورت پورے عالمِ فطرت کی "غرضِ آفرینش" ہے اور یہی ہے جو "بے معنی اگنے والی چیزوں" میں ترتیب و تنظیم قائم کر کے اس سے آرائش اور آسائش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ انسان کا وجود ایک نعمت ہے، اس وجود پہ دکھوں اور حسرتوں کا اتنا بوجھ ہے جس کے سامنے گناہ کا تصور اور گناہوں کی حیثیت کچھ نہیں۔

دم از "وجودک ذنب" زنند بے خبراں
چرا عطیۂ حق را گناہِ ما گویند؟

تصوف کی رسمی عبادتوں اور مابعد الطبیعیاتی بحثوں سے بلند ہو کر غاؔلب نے جہاں فطرت کے حسن کو نظر میں تولا، وہیں انسان کو خدا کے سامنے سربلند پیش کیا، اس کی گردن سے مفروضہ گناہوں اور خوف و دہشت کی ذلتوں کا بار اتار لیا۔

> وہ فارسی اردو کی تمام شاعری میں پہلا شخص ہے جس نے اپنے اعمال کا حساب دینے کے بجائے، خدا سے انسان کی حسرتوں کا حساب طلب کیا ہے اور کھلے لفظوں میں انسان کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔

غاؔلب کی تمام اردو فارسی شاعری میں انسانی عظمت، خود داری اور سرکشی و سربلندی کی روح سنگین ترشے ہوئے پیکر میں شرر کی طرح بیتاب ہے۔

(۶) **غالبؔ** اپنے ارد گرد کی دنیا کو ہی نہیں، خود اپنے عمل کو بھی تنقید کی کسوٹی پر رکھتا ہے۔ ساٹھ برس کے طرزِ فکر اور رنگ سخن کو نظر میں رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کے ہاں دنیا کے مفکّر اہل قلم کی طرح تخلیقی عمل ہی تنقیدی عمل بنتا گیا ہے۔ اس نے ہر زمانے میں یقین کو شک کی جان لیوا سرنگ سے گزارا، اور حقیقت کی تلاش پر کسی عقیدے کا اجارہ تسلیم نہیں کیا، آدمی اور اس کے مسائل پر، حقیقت اور اعتقاد کے اختلاف پر جتنی اس کی نظر گہری ہوتی گئی، وہ اپنی انوکھی روش سے روش عام کا فاصلہ کم کرتا گیا، دشواری سے سہل بیانی کی طرف، بیزاری سے اُنس کی سمت، اور پیچیدگی سے سادگی کی جانب بڑھتا گیا۔

> عمر اور تجربے کی آخری پختگی کو پہنچتے پہنچتے غالبؔ نے نہ صرف یہ کہ اندازِ بیان کو عام پسند سانچوں میں ڈھالا بلکہ عام زندگی کی کھُردری اور بظاہر غیر شاعرانہ حقیقتوں اور حالتوں کو چن کر اپنی شاعری کا موضوع بنایا، سڑکوں اور گلیوں میں پڑی ہوئی باتوں سے شعر تراشے اور انھیں زبان و بیان کی سادگی و نرمی عطا کی کہ اس کے تقریباً دو سو شعر اور مصرعے دلوں میں اتر گئے اور زبانوں پر چڑھ گئے۔

اس قسم کے خیالات کو غالبؔ سے پہلے شاعری کا موضوع نہیں سمجھا گیا تھا ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

—— یا ——

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ؟

روزمرہ کی بظاہر معمولی سی باتوں کو شاعرانہ حسنِ بیان دے کر غالبؔ نے روزمرہ کی زبان کا حصہ بنا دیا اور جب غالبؔ کے یہ تقریباً دو سو شعر اور مصرعے زبان کا جزوِ بدن بن چکے، تب غالبؔ کے اس کلام کی طرف توجہ ہوئی جو مذاق عام سے

بالکل ہٹا ہوا اور دشوار گزار تھا۔

ادب کے ذوق کی مثل، خود غالب کی شاعری بھی مقبولیت کے کئی درجے رکھتی ہے۔ کمتر ایسا حصہ ہے جسے بالکل ہی عام لوگوں تک رسائی حاصل ہوئی، اس سے کچھ زیادہ وہ کلام ہے جو درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ ذوق کی تربیت کرتا ہے اور فارسی و اُردو کا کم سے کم مشہور کلام ایسا ہے جو اعلا درجے کا ادبی ذوق رکھنے والوں میں عام ہو چکا ہے اور عام ہوتا جاتا ہے۔ یہی وہ حلقہ ہے جو غالب کے نازک، باریک اور دشوار شعروں سے اپنے علمی و ادبی ذوق کو صیقل کرتا اور غالب کے اشعار سے الفاظ و تراکیب نکال کر اپنے ہاں سجاتا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں پچاس سے زیادہ ادبی کتابوں کے نام غالب کے کلام سے چن کر رکھے گئے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۷) کچھ عرصے سے اردو کے ادبی حلقوں میں ایک رَو چلی ہے غالب کو عہد حاضر کا شاعر کہنے کی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ غالب نے انفرادیت، تشکیک اور فرد کی تنہائی کو ادبی لہجہ عطا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی شاعری انسان کو اس کے پھیلاؤ یا حدِ نظر میں، افق تا افق ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس کی گہرائی میں بھی اترتی ہے۔ تینوں فاصلوں (Three Dimensions) میں آدمی کے وجود اور مسائل کی تلاش ہر زبان کی بڑی شاعری کا وصف رہا ہے، غالب کے ہاں یہ وصف بہت نمایاں ہے۔ وہ آدمی کے باطن کو ایسی کتاب پاتا ہے جس کے ورق کبھی نہیں الٹے گئے "ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ" اور تنہائی میں بھی وہ تنہا نہیں رہتا بلکہ خیالوں اور فکروں کا طوفان برپا رکھتا ہے "ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو"۔ "ہیملٹ" میں ڈنمارک کے شہزادے کی طرح ذہن کی بیداری وجود کی بے قراری بنی رہتی ہے ؎

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

غالب اس الجھی ہوئی دنیا میں فرد کو بے بس دیکھنا قبول نہیں کرتا — بلکہ زندہ رہنے کے جتنے امکانات ہیں ان پر حاوی یا اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔ حیات کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھتا ہے اور زندگی کے ہر منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

۱

”انفعال“ یعنی اثر پذیری اور بے بس اُداسی کو وہ انسان کی زندہ رہنے کی امنگ کے خلاف جانتا ہے اسے ”ہنگامۂ زبونیِ ہمت“ قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے غالؔب کی آواز ان وجودی (Existentialist) فلسفی ادیبوں سے مل جاتی ہے جو مذہبی عقائد کی رہنمائی اور ماضی و مستقبل کے دونوں پاٹوں سے بے نیاز ہو کر موت و حیات کے رشتے کی تلاش حال میں کرتے ہیں۔

غالؔب نے خیاؔم اور حافؔظ دونوں سے آگے جا کر ”نہاں خانۂ دل“ میں نقب لگائی اور فرد کے باطن کی گہرائی کو چھوا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں ”آدمی نہیں، آدم شناس ہوں“ (۱۸۶۴ء کا خط بے خبر کے نام)۔ یہ بتایا کہ ”آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً، باوجود فراغِ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے!“ غم صرف روٹی کی فکر کو نہیں کہتے۔ وہ اس سے بہت گہری کیفیت ہے۔ غم انسان کے باطن کی صفائی اور کردار کی خوبی کے لیے ضروری شرط ہے۔ ان پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کے بعد بھی غور طلب نکتہ یہ ہے کہ غالؔب کے اشعار مفہوم کی کئی تہیں رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کے اپنے رجحان پر بھی موقوف ہے کہ وہ کسی شعر کو کس مفہوم کے ساتھ کھولنا چاہتا ہے۔ محض شخصی، نفسیاتی، فکری، سماجی یا سیاسی سطح پر —— یا بیک وقت کئی سطحوں پر ان سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جو لوگ اردو کے حرف سے واقف نہیں، وہ بھی یہ شعر پڑھتے ہیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

بظاہر سامنے کی بات ہے اس لیے عام زبانوں پر چڑھ گئی کسی الجھن میں یہ شعر اپنی اوپر کی تہہ کھولتا ہے۔ پھر دل کی نادانی ”درد تنہائی“ کے عذاب میں گرفتار ہو کر بھی اس شعر کو اپنے اوپر طاری کر سکتی ہے۔ فرد کا سماج سے اجنبیت محسوس کرنا (Alienation) بھی ایک ”درد“ ہے جس کی دوا دلِ ناداں کو نہیں ملتی۔ تخلیق کا کرب بھی ایسا درد ہے جس کی دوا بعض اوقات نہیں پائی جاتی، جینے کی امنگ اور موت کا جبر بھی ایک ”درد“ ہے اور عظیم الشان سلطنت یا تہذیب کے ٹکڑے اڑتے دیکھنا بھی ”درد“ اٹھاتا ہے جس کی دوا ”دلِ ناداں“ کو نہیں معلوم۔ غرض جتنے اور قسم کے درد ہوں گے اتنے ہی پہلوؤں سے اس معمولی سے عام پسند شعر کو سمجھا جا سکے گا۔ مشکل اور باریک شعروں میں یہ تہہ در تہہ کیفیت

اس قدر ہے کہ بعض اشعار کو شارحین نے اپنے اپنے طور پر سمجھا کر آٹھ، نو مطلب نکال لیے ہیں۔

قوس قزح کی سی اسی رنگا رنگ کیفیت نے (جس کا احساس خود شاعر کو بھی تھا) غالب کے کلام کو متضاد فکری اور ادبی حلقوں میں مقبول بنایا ہے اور تلاش کی ترغیب دلائی ہے۔

(۸) غالب کے کلام کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں "اداسی" یا "درد" کو اتنا ہی پایا جا سکتا ہے جتنا مسرت اور شگفتگی کو ـــ سوچ کی سنجیدگی نے شاعر کے لہجے میں جو ایک متانت اور وقار پیدا کیا ہے اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ غم کا عنصر غالب کے ہاں حاوی ہے، لیکن غم کو جس جس پہلو سے دیکھا جائے، میر تقی میر یا میر درد کے کلام میں غالب سے بھی زیادہ ہے۔

> غالب کے ہاں غم اور رنج یا درد ہم معنی نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں شگفتگی کا لہجہ زندہ دلی کی لے، شوخی اور مسکراتا ہوا طنز محض ایک نقاب نہیں بلکہ زندگی کے برتاؤ اور شخصیت کے سبھاؤ کی حیثیت سے نشاط کی کیفیت میں گھل مل گئے ہیں۔ آنسوؤں کو طنزیہ تبسم بنانے میں غالب کی فنکاری کا راز کھلتا ہے۔ غالب کھلنڈروں اور بے فکروں کی طرح قہقہہ نہیں مارتا، وہ اپنے زمانے پر بھی طنز کرتا ہے، اس کی عادات پر بھی، اس کے اداروں اور اہم شخصیتوں پر بھی اور خود اپنے آپ پر بھی۔ وہ سودا یا انشا کی طرح افراد یا حالات کا مذاق نہیں اڑاتا، خیام و حافظ کی طرح چھیڑ خانی کرتا ہے اور ان دونوں سے زیادہ بیباک اور دوٹوک لفظوں میں، وہ شکایت یا افسوس نہیں کرتا، بے نیازانہ کٹیلے طنز سے درد کو احتجاج بنا دیتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے !

ـــ یا ـــ

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

۱

اس لب و لہجے میں غالب کو اردو کے دوسرے شاعروں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔

خود غالب کے بقول وہ سینے میں غم چھپا کر اسے تبسم میں ڈھالنا جانتا ہے۔ عام و خاص، دانا اور نادان دونوں پر ہنستا ہے — اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی زندگی اور آدرشوں کے تضاد پر، اپنے حالات اور تمناؤں کے بے جوڑپن پر، عقل اور خواہش کے تقاضوں کی کش مکش پر غالب ہی سب سے زیادہ ہنستا اور ہنساتا ہے۔

(۹) غالب کے کلام میں "صوتی آہنگ" لفظی حسن اور آوازوں سے اُبھرنے والی تصویروں کا ایسا نگارخانہ سجا ہوا ہے جس کی طرف حال میں توجہ کی گئی ہے۔

شروع میں اس کے ہاں چ، ژ، ش کی آوازوں کی کثرت تھی اور فارسی شاعری کا پر شوق لہجہ طاری تھا، پھر د، ت، س کی آوازیں بڑھتی ہیں اور آخری پندرہ سترہ سال کے کلام میں نرم غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ن، م، ر، س کی آوازوں کی تکرار ہوتی ہے۔ گہری فکر انگیز اور قریب المخرج آوازوں کی جگہ نرم موسیقی لیتی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں کلاسیکی مثنویوں کی بحریں چھوڑ کر باقی ۳، ۴ بحروں کا استعمال زیادہ ہوا ہے اور یہ وہی بحریں ہیں جو "شش مقام" کی عام پسند موسیقی میں رنگ لاتی ہیں اور ہند ایرانی موسیقی سے میل کھاتی ہیں مثلاً مفعول، فاعلات، مفاعیل فاعلن / مُفتعلن، مفاعِلُن مُفتَعِلُن مُفاعِلُن / مفاعِلات مُفاعیلُ، فاعلن، فعلن / مفعول، مفاعیلن مفعول مفاعیلن / فاعلات اور مستفعلن کو عموماً زحافات کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ فارسی اُردو میں بمشکل دس غزلیں ایسی ہیں جن کی بحریں ہندستان میں گائی جانے والی بحروں کی موسیقی سے کسی قدر ہٹ گئی ہیں۔ مثلاً "قرار نہیں ہے"، "قدم آگے"، "لرزد"، "چہ غمستے" کی ردیف والی غزلیں۔ غالب نے مقررہ بحروں میں زحاف کی کمی بیشی کر کے صوتی آہنگ کا انوکھا تجربہ کیا اور دیکھ لیا کہ ایسا کلام زبانوں پر عام نہیں ہو سکا۔

(۱۰) غالب نے اپنے کلام کا صرف انتخاب ہی شائع کیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ اس مجموعے سے باہر جو ملے اُسے میرا کلام شمار نہ کیا جائے۔ اس انتخاب سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ پہلے کے لکھے ہوئے اشعار میں دونوں سمت سے

اِصلاح کی گئی ہے۔ ایسے لفظوں کے ذریعے جو ادائے مطلب میں مدد دیں اور ایسے مصرعوں یا ترکیبوں سے جو خیال کی ڈور تھامنے کے علاوہ زبان سے ادا کرنے پر بھی اچھے معلوم ہوں۔ لفظوں کی تراش اور مصرعوں کی مجموعی آواز میں بھی غالبؔ ایک اعلا درجے کا فنکار نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ اور اسی ضمن میں اُبھرتا ہے: اردو کے کسی شاعر کے ہاں اتنی غزلیں یکجا نہیں ملتیں جو اوّل سے آخر تک منتخب اشعار کا مجموعہ ہوں یا جن میں اوّل درجے کے اشعار ایک ہی غزل میں اس طرح پِرَئے ہوئے ہوں کہ خیال ایک ہی کیفیت کے مختلف پہلوؤں یا مرحلوں کا لطف لے سکے۔ ان میں باطنی رشتے کے علاوہ آوازوں اور لفظوں کا بھی حُسن ہموار نظر آتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ جہاں دوسرے اساتذہ کے صرف چُنے ہوئے شعر یادوں میں محفوظ رہ گئے ہیں، غالبؔ کی سادہ، رواں اور عام فہم غزلوں بلکہ قصیدوں اور قطعوں کے بھی کئی ترتیب وار اشعار زبانوں پر رواں اور ذہن نشین ہوئے ہیں اور ادبی ذوق کے مختلف درجوں میں الگ الگ لُطف دیتے ہیں۔

غالبؔ کے شعر کا طلسم کُھلتا ہے شاعر کے برتاؤ کو سمجھنے سے۔ وہ زندگی اور فن دونوں میں، بہت واضح طور سے اپنا برتاؤ جتاتا ہے۔ یہی برتاؤ اُدھ کھُلا باطنی رشتہ ہے جو وقت کے ساتھ ابھرتا اور نکھرتا رہا ہے۔ اس کے کلام کے درمیان جو شعر اس زندہ، بیقرار، شگفتہ، شاداب، آرزومند وجود کے برتاؤ سے میل نہیں کھاتے وہ صرف لطفِ سخن کی خاطر یا کسی رواں دواں لمحے یا اتفاقی خیال کو لفظوں کی گرفت میں لانے یا محض چُہل کی خاطر کاغذ تک اُتر آئے، وہ اس بھری پُری محفل میں وقتی حاشیہ نشینوں یا نیازمندوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

"باکارم و بیکارم چوں مد بہ حساب اندر"

غالب کی مقبولیت کا راز اُس کی فنی بصیرت میں ہے اور فنی بصیرت کے اسرار قدیم و جدید کی آویزش و آمیزش میں تہ در تہ چلے گئے ہیں۔ غالب نے، کیا معنی آفرینی اور کیا لفظ تراشی، دونوں سمتوں سے فارسی اردو کی ادبی وراثت پر ردّ و قبول کا بے رحم عمل کیا ہے، اور ردّ و قبول کے اس بے رحمانہ عمل نے ہی اس کی شاعری کو توانائی اور تازگی بخشی ہے۔ ••

۱

انتخاب

کلامِ اُردو

غزلیات

۱

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پُوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا
آگہی، دامِ شُنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عَنقا ہے، اپنے عَالمِ تقریر کا

۱

بس کہ ہوں، غالب، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

۲

شمارِ سُبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صَد دِل پسند آیا

بہ فیضِ بے دِلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اسد، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

۳

جُز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حَسُود تھا

تھا، خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھُل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سُود تھا

۱

ڈھانپا کفن نے داغِ عُیوبِ برہنگی
مَیں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رُسوم و قُیود تھا

۴

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا"
دل کہاں کہ گُم کیجے؟ ہم نے مُدّعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرات آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر، یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے: ”تم نے کیا مزا پایا؟“

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم، یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

۵

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا، غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

چند تصویرِ بُتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

۶

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھُوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دلِ گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس، جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش، منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

۷

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں، غالبؔ
گرچہ دل کھول کے، دریا کو بھی ساحل باندھا

۸

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک، تیرا بھی دل، مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں، اِک دیدۂ بے خواب تھا

۹

نہ ہوگا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوقِ کم میرا
حَبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گُل سے، ناک میں آتا ہے دَم میرا

۱۰

پَئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلتیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو، حُسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکاتِ حُسن دے، اے جلوۂ بینش، کہ مِہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر
رہا، مانندِ خونِ بے گُنہ، حق آشنائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول، غالبؔ، مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توأم ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

۱۱

یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا
پوچھ مت رُسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے، اوراقِ لختِ دل، بہ باد
یادگارِ نالہ، یک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱۲

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب، بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں، مَیں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بَد خُو ہو گا
نبضِ خس سے، تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم، سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تادمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے، کیوں، اُس کو وفادار، اسدؔ؟
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۳

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گُہر میں محو ہوا، اِضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب
مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

حِنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے بھی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیشِ دُنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں، خندہ ہائے بے جا کا
ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے، ہر بُنِ مو، کام چشمِ بینا کا
دل اُس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے، دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا
فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد، اسد
جفا میں اس کی، ہے اندازِ کار فرما کا

۱۴

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے، ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مَے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے، خامہ بیدل کا

۱۵

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا
زیارت کدہ ہوں، دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورتِ تکلّف، بمعنی تاسّف
اسدؔ میں تبسّم ہوں پژمردگاں کا

۱۶

آئینہ دیکھ، اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غُرور تھا!

۱۷

لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۱۸

غافل، بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں، طُرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گُناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پُرگل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا

۱۹

رشک کہتا ہے کہ "اُس کا غیر سے اخلاص حیف!"
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"
شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا

سَو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں؟ کہ دل ہی عَدو ہے فَراغ کا

۲۱

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
دَر و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دَم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ، ازبسکہ، تقاضائے نِگہ کرتا ہے
جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نَشاط
تُو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنّا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حَیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۲۲

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف، داغِ مہ، مُہرِ دَہاں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
وائے! اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

۲۳

قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفَس پرور ہوا
خطِ جامِ مے، سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۲۴

دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا، ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا
مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آش

خود پرستی سے، رہے باہم دِگر نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

رَبطِ یک شِیرازۂ وحشت ہیں، اجزائے بہار
سَبزہ بیگانہ، صبَا آوارہ، گُل نا آشنا

۲۰

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار، باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مَے، کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ اَیاغ کا
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خَلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں، دُودِ چراغ کا

۲۵

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنّا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گُم گشتہ، مگر، یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
کیا ہی رِضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خُلد میں، گر یاد آیا
مَیں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۶

تُو دوست کسی کا بھی، ستمگر نہ ہوا تھا
اَوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا، مہِ نَخشَب کی طرح، دستِ قضا نے
خُرشید، ہنوز، اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمّت ہے اَزل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالَم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
مَیں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۲۷

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے، بہ نوکِ نیشِ عقرب ہا
اسد کو بُت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یا رب ہا

۲۸

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کُشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی، اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا
بر رُوئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

۲۹

سرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

۳۰

ایک ایک قطرے کا، مجھے دینا پڑا، حساب
خونِ جگر، وَدیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئنہ، تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

۳۱

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبَرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اِس رہ گزر میں، جلوۂ گُل، آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی، کش مکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب، چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی، خَیال بیاباں نَوَرد تھا
یہ لاشِ بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا

۳۲

محرم نہیں ہے تُو ہی، نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
تُو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز!
میں اور دُکھ تری مِژہ ہائے دراز کا

ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

۳۳

دوست، غم خواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا"؟
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر، میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا؟
ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت، اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے، کھاویں گے کیا؟

۳۴

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا
دل ہوا، کشمکشِ چارۂ زحمت میں، تمام
مٹ گیا، گھسنے میں، اس عُقدے کا وَا ہوجانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ، اللہ!
اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا
ضعف سے، گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باوَر آیا ہمیں پانی کا ہَوا ہوجانا
دل سے مِٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہوجانا

ق

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وَا ہو جانا
تا کہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

۳۵

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ، اِک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشا، تیرے جلوے نے
کرے جو، پرتوِ خورشید، عالم شبنستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے، اک صورت خرابی کی
ہیُولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مَدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا
خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا، حُجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۳۶

ہَوَس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مُدّعا کیا؟
کہاں تک، اے سراپا ناز، "کیا، کیا؟"
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟

نگاہِ بے محُابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس، یک نفَس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نفَس مَوجِ محیُطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا؟
دماغِ عَطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبَا کیا؟
سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن!
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ "انا البحر"
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟
محُابا کیا ہے؟ میں ضامن، اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوُں بہَا کیا؟
کیا کس نے جگرداری کا دعوٰی؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھَلا کیا؟
یہ، قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں؟

یہ، کافر، فتنۂ طاقت ربا کیا؟
بلائے جاں ہے، غالبؔ، اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، اَدا کیا؟

۳۷

مَیں اور بزمِ مَے سے یُوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
درماندگی میں، غالبؔ، کچھ بَن پڑے، تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کُشا تھا

۳۸

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گِلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

۳۹

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا؟
تم سے بیجا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گِلہ

اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تُو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے، ترے وحشی کو، وہی زُلف کی یاد
ہاں، کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟
بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی!
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

عشق میں ہم ہی نے ابرام سے پرہیز کیا   ورنہ جو چاہیے، اسبابِ تمنّا سب تھا
آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا [۴۴]   دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو، غالبؔ
کہتے ہیں: ”اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا“

۴۱

ذکر اُس پری وَش کا اور پھر بیاں اپنا
بَن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا
مَے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب؟
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
مَنظر اِک بُلندی پر اور ہم بنا لیتے
عَرش سے اِدھر ہوتا، کاشکے، مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلّت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں، اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا
گِھستے گِھستے مِٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غَمّازی، کرلیا ہے دُشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے، ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دَانا تھے؟ کس ہُنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا، غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

۴۲

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیئے ہم، تو یہ جان، جھُوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا، اگر اُستوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؛ شبِ غم بُری بَلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مَر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۴۳

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں، تو کیا ہوتا؟
ہوئی مُدّت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ "یُوں ہوتا، تو کیا ہوتا؟"

۴۴

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا
رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اِس تکلّف سے کہ گویا بُت کدے کا در کھُلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟
آستیں میں دَشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھُلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہے خَیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اِک در ہے، میری گور کے اندر کھُلا

مُنہ نہ کھُلنے پر، ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نِقاب اُس شوخ کے مُنہ پر کھُلا

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا!
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

۴۵

جَور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں، "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا؟"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بَر کے ساتھ ساتھ؟
یارب، اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خُوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا!
پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

۴۶

دردِ مِنّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اِک تماشا ہوا، گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟
تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مِرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یُوں ہے کہ حق اَدا نہ ہوا
زخم گر دَب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا، رَوا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دِل ستانی ہے؟
لے کے دِل، دِل ستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

۴۷

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا، نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
کم نہیں، نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے، جو دُکھ کہ کسی کو نہ مِلا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

۴۸

بہ مُہرِ نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا؟
کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

۴۹

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ، ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

۵۰

پھر وہ سُوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے، گُلستاں کے ہَواداروں کا

۵۱

عیب کا دریافت کرنا ہے ہُنرمندی، اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مُطّلع، کامل ہوا

۵۲

اسدؔ، اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

ان دِلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے — رُوٹھا جو بے گناہ، تو بے عُذر مَن گیا
خوشی جینے کی کیا، مَرنے کا غم کیا — ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا
پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی   رَوزن کی طرح، دید کا آزارہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعُوبت سے بے خبر   آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

۵۳

پھر ہُوا وقت، کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہَوا موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہَوا موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہے طوُفاں طرب سے ہر سُو
موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر رُوحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

◆

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گُل !
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

۵۴

عمر میری ہو گئی صَرفِ بہارِ حُسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر، کارِ اسدؔ
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب   نظام الدین کو خسروؔ، سراج الدین کو غالبؔ

۵۵

افسوس، کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۵۶

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

نہیں گر، سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

رہے، غالبِ خستہ، مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے، حضرت سلامت؟

۵۷

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے، پر، کس وقت

۵۸

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

ق

غیر یُوں کرتا ہے میری پُرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست
تا کہ مَیں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے، پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زُلفِ عنبر بارِ دوست
چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

۵۹

گُلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

۶۰

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

۶۱

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے، انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

۶۲

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ"

۶۳

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھُٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و اَدا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سِیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بُتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مَے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صَلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بَلا میرے بعد

تھا مَیں گلدستۂ احباب کی بندش کی گِیاہ
متفرّق ہوئے میرے رُفقا میرے بعد

۶۴

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بُلند
اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند!
بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اُسدؔ در ہر نفس بقدرِ نفس ہے، قبا بلند

٦٥

بلا سے ہیں، جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں، بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

٦٦

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام "ستمگر" کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سَر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بُتِ کافر کا پُوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافَر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گُفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں مَیں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

۶۷

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مِینا پہ خُونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن، عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
گِرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۶۸

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالبؔ، کیا ہوا اگر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۶۹

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
ہر چند سُبک دَست ہوئے بُت شِکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جَلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دَم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رَواں اور
ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے ؞ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ستم کش مصلحت سے ہوں، کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

۷۰

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیّر آب برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر

۷۱

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ "مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

۷۲

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؛ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سَر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا، کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

مدعی، میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا، زشت رویوں کا عتاب آئینے پر
دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے، غالب کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینے پر؟

۷۴

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

۷۵

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز
نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

۷۶

کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

* * *

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکُل!
مَیں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا
مَیں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز!

۷۸

ہجومِ فکر سے دِل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

۷۹

گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

۸۰

مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
مَیں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اِک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن، بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مَر گیا پھوڑ کے سَر غالبِ وحشی ہے! ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

سنینِ عُمر کے ستّر ہوئے شمار برس   بہت جیوں تو جیوں اَور تین چار برس

٨١

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خارِ آتش

٨٢

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے، مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لَرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پَرفشانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

۸۳

چار سُوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے
عقل کے نقصاں سے اُٹھتا ہے خیالِ انتفاع
آشنا، غالبؔ، نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع؟

۸۴

بَدتراز ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانۂ بُلبل، بغیر از خندۂ گُل، بے چراغ
پتّہ پتّہ اب چمن کا انقلاب آمودہ ہے
نغمۂ مرغِ چمن زا، ہے صَدائے بوم و زاغ
چشمِ پُرنم رہ، زمانہ مُنقلب ہے اے اسدؔ   اب یہی ہے بس، مُئے شادی سے پُر ہو نا ایاغ

جلتا ہے دل، کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

۸۶

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چُنتا تھا نمک
اِس عمل میں عیش کی لذّت نہیں مِلتی اسدؔ
زورِ نسبت مَے سے رکھتا ہے نصاریٰ کا نمک

۸۷

آہ کو چاہیئے اِک عُمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خُونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن!
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
مَیں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۸۸

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ   یعنی بغیر یک دلِ بے مُدّعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مِرے گُنہ کا حساب اے خُدا نہ مانگ

۸۹

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ ہوائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹُوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مَر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خُونیں نوائے گُل

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو

رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گُل سر بہ پائے گُل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خُوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

۹۰

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

۹۲

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زُلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

۹۳

تماشائے گلشن، تمنّائے چیدن
بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
اسد، شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنّا سے ناچار ہیں ہم

۹۴

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ؟
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں
تھی وہ اِک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھُوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۹۵

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھّوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجُود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں
دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۹۶

ممکن نہیں کہ بھُول کے بھی آرمیدہ ہوں
مَیں دشتِ غم میں آہوئے صیّاد دیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
مَیں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ وَرَع کے حلقہ میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں مَیں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جسطرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا، عبث   پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہُوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج   مَیں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہُوں

۹۷

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۹۸

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں؟
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں؟
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں؟
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں؟

مَیں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو، اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گُماں سے مجھے منفعِل نہ چاہ
ہے، ہے خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں

۹۹

مہر باں ہو کے بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
مَیں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سَر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر مِلتا ہی نہیں مجھ کو سِتم گر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے مِلنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

۱۰۰

مت ہو جیو اے سیلِ فنا اُن کے مقابل
جاں بازِ اَلَم، نقش بہ دامانِ بقا ہیں
اے وَہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشّاق فریبِ حق و باطل سے جُدا ہیں
اب مُنتظرِ شورِ قیامت نہیں، غالبؔ   دُنیا کے ہر اِک ذرّے میں سو حشر بپا ہیں

١٠١

ہم سے کُھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرّۂ اَوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دِل غنیمت جانیے
بے صَدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
دھول دَھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

١٠٢

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گُماں نہیں
اِک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کِس مُنہ سے شکر کیجیے اِس لُطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مَّزِید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاَماں نہیں
ہے ننگِ سینہ دِل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سَرنوشت میں"
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی مَیں
رُوح القُدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۱۰۳

مانعِ دشت نَوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دَوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادۂ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دَمِ شمشیر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجُز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

میر کے شعر کا اَحوال کہوں کیا، غالب؟
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

۱۰۴

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویِٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

۱۰۵

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دَست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید، نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید، نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۱۰۶

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کِس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

جس دن سے کہ ہم غمزدہ، زنجیر بپا ہیں   کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

مِلتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ مِلتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عُمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں
جو مُنکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
مَیں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وَہم نے کس پیچ و تاب میں
مَیں اور حَظِّ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نَذر دینی بھُول گیا اِضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خَس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مُدّعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالبؔ چھُٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۱۰۸

کل کے لیئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سَماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رَخشِ عُمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اِتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حَیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دَھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اِک اَدائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہُود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیٔ بُوترابؑ میں

۱۰۹

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لُوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو مَیں"
جانا پڑا رقیب کے دَر پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہے کیا؛ جو کَس کے باندھیے میری بُلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں
پھر بے خودی میں بھُول گیا راہِ کوُئے یار
جاتا وگرنہ ایک دِن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دِل پذیر متاعِ ہُنر کو میں

۱۱۰

ذکر میرا بہ بُدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمَر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصُور نہیں

ظُلم کر ظلم! اگر لطف دریغ آتا ہو
تُو تغافل میں کسی رنگ سے معذُور نہیں

مَیں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کِس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حُور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حُجّت ہے کہ مشہُور نہیں!

۱۱۱

نالہ جُز حُسنِ طلب، اے سِتم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جَفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دُشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اِستاد نہیں
سَبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مُرغ! کہ گلزار میں صَیّاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کُوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے وَلے، اِس قدر آباد نہیں
کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں!

۱۱۲

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں؟
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

۱۱۳

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

۱۱۴

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد، یاں

۱۱۵

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں، اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں
ہم اَوجِ طالعِ لعل و گہُر کو دیکھتے ہیں

۱۱۶

نہیں، کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہُوں مَیں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اَور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامُراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دِل کہ شاد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ؟
یہ کیا؟ کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

۱۱۷

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہَوا باندھتے ہیں

آہ کا کِس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اِک اپنی ہَوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عُمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گُل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خُوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۱۸

دائم پڑا ہوا ترے دَر پر نہیں ہوں مَیں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں مَیں
کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دِل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں مَیں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کِس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کِس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کِس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟
غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دِن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۱۹

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نِسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دِل کے پار؟
جو مِری کوتاہیٔ قسمت سے مِژگاں ہو گئیں
واں گیا بھی مَیں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
مِلّتیں جب مِٹ گئیں اَجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہو گئیں
یُوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۱۲۰

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اِک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
مِلنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عِشق عُمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سَر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اِک طرف
یاں دِل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
دِل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے دشمنی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اِس سادگی پہ کون نہ مَر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسدؔ کو خَلوت و جَلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۱۲۱

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز
دلے بدستِ نگارے نداده رکھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے، بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

۱۲۲

نہ جانوں نیک ہوں یا بَد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خَس ہوں تو ہوں گلشن میں

اسدؔ زندانیٔ تاثیرِ اُلفت ہائے خُوباں ہُوں
خمِ دستِ نوازش ہوگیا ہے طوق گردن میں

۱۲۳

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گزر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و دَر میں خاک نہیں
ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کُھلا، کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

۱۲۴

دَیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنّا
وَاماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

دِرم و دَام اپنے پاس کہاں!
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں!

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خِشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دَیر نہیں، حَرم نہیں، دَر نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنہ چھپائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں
حُسن اور اس پہ حُسنِ ظَن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں
وَاں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم مِلیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا! کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا، کہ یُوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں
پُرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اِک اشارے سے نکلے ہے یہ اَدا کہ یُوں
رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیئے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یُوں
"غیر سے رات کیا بنی"؟ یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یُوں
بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدّعا کہ یُوں
مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وَضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یُوں
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ مُحیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں

۱۲۷

اسدؔ، بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے، تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عُریاں ہیں

۱۲۸

فتادگی میں قدم اُستوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
طلسمِ مستیِ دل آں سوے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالبؔ
بسانِ دشت، دلِ پُرغبار رکھتے ہیں

۱۲۹

دل کو اظہارِ سخن، اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

۱۳۰

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ مَعاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

۱۳۱

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کِشت کو

۱۳۲

وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے "کہتے ہیں" ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی، بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں!
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خُو کے دَر سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

۱۳۳

قفس میں ہُوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مُرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں!
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں تیرے توسن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مَرے بُت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یُوں بے خبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

۱۳۴

سِتم کشی کا کیا دِل نے حوصلہ پیدا   اب اس سے رَبط کروں جو بہت ستمگر ہو

۱۳۵

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضِد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پانو
غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو!
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

۱۳۶

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمّید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی سِتم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کُھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

۱۳۷

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گُناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گُنہ کُش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں مَیں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب! اور مرا بادشاہ ہو

۱۳۸

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو
تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دِن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو
ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پُوچھیں نہ وو تو کیوں کر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گُماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو
مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو"

۱۳۹

کسی کو دے کے دِل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سَر بن کے کیا پُوچھیں کہ ہم سے سَرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو؟ "ہم دل میں نہیں ہیں" پَر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جُرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی"؟
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

۱۴۰

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ھم زباں کوئی نہ ہو
بے دَر و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۱۴۱

حُسنِ بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں، دل تماشائی نہ ہو
بزمِ کثرت عالمِ وحدت ہے بینا کے لیئے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو

۱۴۲

وَضع نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب سِتم و جَور گوارا ھم کو
تختۂ گور، سفینے کے مماثل ہیں اسد
بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

از مہر تا بہ ذرّہ، دِل و دِل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

۱۴۴

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پُوچھ
ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پُوچھ

ہندوستان سایۂ گُل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہد وصالِ بُتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جدائیِ اسداللہ خاں نہ پوچھ

۱۴۵

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب
چاہیئے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

۱۲۶

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں
ہے سُخن گَرد ز دابانِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اِک فرد جہاں میں وَرَقِ ناخواندہ
حیف بے حاصلیِ اہلِ ریا پر غالبؔ
یعنی ہیں ماندہ ازاں سو، و ازیں سو راندہ

۱۲۷

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و اُمید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دِل نہ سمجھ، بَلا سمجھ
گاہ بخُلد امیدوار، گہ بجحیم بیمناک
گرچہ خُدا کی یاد ہے، کُلفتِ ماسوا سمجھ
اے بسرابِ حُسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو مُنفعِل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ
نے سر و برگِ آرزُو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خَلق، تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اِس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہُوا اور سہی
تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
تیرے کُوچہ کا ہے مائل دلِ مُضطر میرا
کعبہ اِک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خُلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سَیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بے دادگرِ رنج فزا اور سہی

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھَوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اِک اَور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ق

سَر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رُو سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے
نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

۱۲۹

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مِرے دامِ تمنّا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم؟
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ !
مِرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خُوں وہ بھی
مَے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردُوں سے کیا کیجے
لیئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگُوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۵۰

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں کانٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیماں و جامِ جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۵۱

ہے بزمِ بُتاں میں سُخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
رندانِ درِ مے کدہ، گُستاخ ہیں زاھد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے اَدبوں سے

کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں
خواری کو بھی اِک عار ہے عالی نَسبوں سے

۱۵۲

رنج طاقت سے سوا ہو تو نبیڑوں کیوں کر
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ اَزل تم نے لکھا ہے تو سہی

۱۵۳

غالب زبسکہ سُوکھ گئے چشم میں سرشک   آنسُو کی بُوند گوہرِ نایاب ہو گئی

۱۵۴

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں، شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خُوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

۱۵۵

تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم ان کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

۱۵۶

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سُبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گُلفام گر برسا کرے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

۱۵۷

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت، دل میں سوزِ غم چھپانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لکدکوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بُتوں کے ناز اُٹھانے کی
کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے، جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

۱۵۸

تمثالِ جلوہ عرض کر، اے حُسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

۱۵۹

کمالِ حُسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو   تکلّف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

۱۶۰

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پُرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
کی اس نے گرم سِینہ اہلِ ہَوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا!
بس چُپ رہو، ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

۱۶۱

دَرد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تِری غفلت شعاری ہائے ہائے
تِرے دِل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگُساری ہائے ہائے
کیوں مِری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عُمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رُسوائی سے جا چھُپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مِل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
کِس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرُومِ جمال
ایک دِل تِس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے

عِشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دِل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

۱۶۲
سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو
اِتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے؟

۱۶۳
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسد
دل وقفِ درد رکھ کہ فقیروں کا مال ہے
صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے ۱۶۴ غافلاں، آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

نظر بنقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعویِ چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

١٦٦

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
مَیں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

ہر چند عمر گزری آزردگی میں، لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

۱۶۷

آگ سے پانی میں بُجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھُل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

۱۶۸

خزاں کیا؟ فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پَر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

۱۶۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی؛
اے وہ مجلس نہیں خُلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عُمر ہرچند کہ ہے برق خرام
دل کے خُوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تِری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۷۰

ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے
کرتا ہے بس کہ باغ میں تُو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

۱۷۱

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

۱۷۲

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
مَیں، اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے!

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کِیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم!
تُو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عُدو؟
کس دن ہمارے سَر پہ نہ آرے چلا کیے
صُحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضِد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

۱۷۳

رفتارِ عُمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اِس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
زخمی ہُوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گُماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
مَیں نامُراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۶۴

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
مَیں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یارب! وہ کیوں کر منعِ گُستاخی کرے؟
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
دُور چشمِ بد! تری بزمِ طرب سے واہ وا!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اَور نازک بن گیا
رنگ کُھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۱۷۵

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم!
لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پَر و بالی نے مجھے

۱۷۶

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

۱۷۷

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۷۸

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے، وَاماندگی سے عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر، کہ کِس مشکل میں ہے

۱۷۹

دل سے تِری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رَضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوُئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پَر گئی

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

ہر بُوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دے کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ وَلولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

١٨٠

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

١٨١

نشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ٭ صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

۱۸۲

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بَر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اَعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بَلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بَلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۸۳

کوئی اُمید بَر نہیں آتی
کوئی صُورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن مُعیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی، ہی بات جو چُپ ہُوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مَرتے ہیں آرزُو میں مَرنے کی
مَوت آتی ہے پَر نہیں آتی
کعبہ کِس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ ؟
شرم تم کو مگر نہیں آتی !

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے ؟
آخر اِس دَرد کی دَوا کیا ہے ؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار !
یا اِلٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟
مَیں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہُوں
کاش پوچھو کہ ”مُدّعا کیا ہے ؟
جب کہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے ؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و اَدا کیا ہے ؟
شکنِ زُلفِ عنبریں کیوں ہے ؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے ؟
سَبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ؟
اَبر کیا چیز ہے، ہَوا کیا ہے ؟

ہم کو اُن سے وَفا کی ہے اُمّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صَدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہُوں
مَیں نہیں جانتا وَفا کیا ہے؟
مَیں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

۱۸۵

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے
جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ مِلتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اِس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۸۶

پھر کچھ اِک دل کو بے قراری ہے
سینہ جُویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن!
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے
ق
پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حُکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۸۷

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت رَوانی کی

۱۸۸

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دَہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے سِتم ہوئے
لکھتے رہے جُنوں کی حکایاتِ خُوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے عَلَم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی!
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۸۹

یُونہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خُوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عَدو کو یارب! مِلے میری زندگانی

۱۹۰

مری قسمت میں یُوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی
سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر

۱۹۱

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نَے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خُوباں میں دیکھنا
کیا اَوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ ، حوصلہ ساقی ، نگاہ مست
بزمِ خیال مَے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل !
زنہار ! اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صُبحِ دَم جو دیکھیے آکر تو بزم میں،
نے وہ سُرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۹۲

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ اَلم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عُمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

۱۹۳

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ مَیں جانوں اور نہ تُو جانے
نفَس بہ نالہ رقیب و نگہ باشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تُو جانے

۱۹۴

تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کھینچیے
جُوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

۱۹۵

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیے تو گِلا ہوتا ہے"

پُر ہوں مَیں شکوے سے یُوں راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

مَیں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سِوا ہوتا ہے

۱۹۶

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تُو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ اَدا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزئ عدُو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جَلا ہے جسم جہاں، دِل بھی جَل گیا ہوگا
کُریدتے ہو جو اب راکھ، جُستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیۓ ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گُلفام و مُشکبُو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سُبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزُو کیا ہے؟
ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرُو کیا ہے؟

۱۹۷

مَیں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے
قہر ہو یا بَلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لئے ہوتے
میری قِسمت میں غم گر اتنا تھا
دِل بھی، یارب، کئی دیئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دِن اور بھی جِئے ہوتے

۱۹۸

آ کہ، مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت، حیاتِ دَہر کے بدلے
نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دِل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے
تُو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۹۹

دیکھنا حالت مِرے دِل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سَرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

۲۰۰

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تُو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مِرے آزار میں آوے
کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؛ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

۲۰۱

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن!
دِل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۲۰۲

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دَم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
عِشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہُوں مَیں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنّا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

۲۰۳

پھر اِس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اِس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سَبزے کو جب کہیں جگہ نہ مِلی
بَن گیا روئے آب پر کائی
سَبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہَوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

مسجد کے زیرِ سایہ اِک گھر بنالیا ہے   یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خُدا ہے

۲۰۴

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ہوا آئینہ، جامِ بادہ عکسِ روئے گُلگوں سے
نشانِ خالِ رُخ، داغِ شرابِ پرتگالی ہے
اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

۲۰۵

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر، آشفتہ بیانی میری
متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا، دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت اَرزاں ہے گرانی میری

۲۰۶

کیا ہے ترکِ دُنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خدا یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دَر بَدر ناقابلی سے

۲۰۷

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے
بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ، تو پھر
کیوں نہ دِلّی میں ہر اِک ناچیز نوّابی کرے

دِلّی کے رہنے والو اسدؔ کو ستاؤ مت   بیچارہ چند یوم کا یاں میہمان ہے

۲۰۸

گلشن کو تری صحبت ازبس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے

از بس کہ سکھاتا ہے غمِ ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اِک چشم نمائی ہے

۲۰۹

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب! اسے قسمت میں عدو کی

۲۱۰

سیماب پُشت گرمیٔ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دِن بہار کے

۲۱۱

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اس لَب سے مِل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

۲۱۲

جادُو ہے یار کی روشِ گفتگو اسد   یاں جُز فسوں نہیں، اگر افسانہ چاہیے

۲۱۳

چاہیے اچّھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دِل ؟
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل
کچھ اِدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کِس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خُوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صُورت تو دیکھا چاہیئے

۲۱۴

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نُمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
نگہِ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گُلستاں مجھ سے

۲۱۵

نُکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
مَیں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دِل
اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بُھول نہ جائے
کاش یُوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیئے یُوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کِس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بِن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے
بوجھ وہ سَر سے گِرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بَنائے نہ بنے
عِشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

۲۱۶

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دِل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگاہ کو آب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مِرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۲۱۷

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مِرا سَر رنجِ بالیں ہے مِرا تن بارِ بستر ہے
کہوں کیا دِل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اِک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۲۱۸

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
ہرچند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مَت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ "ہے"، نہیں ہے
شادی سے گُذر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

۲۱۹

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۲۲۰

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

اسد ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا ۲۲۱ مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

۲۲۳

دیا ہے دِل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیے
ہُوا رقیب تو ہو، نامہ بَر ہے کیا کہیے
رہے ہے یُوں گہ و بے گہ کہ کُوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
زہے کرشمہ کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بِن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے کیا کہیے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سَرِ رہ گذر ہے کیا کہیے
انھیں سوال پہ زعمِ جنُوں ہے کیوں لڑیئے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے
حسد، سزائے کمالِ سُخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہُنر ہے کیا کہیے
کہا ہے کِس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اِس کے کہ آشفتہ سَر ہے کیا کہیے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!
پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

۲۲۵

طبع ہے مشتاقِ لذّت ہائے حسرت کیا کروں؛
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دِل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عِشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

۲۲۶

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تَن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے ہے دِل میں تیر اچھّا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شِستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دَہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مِرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کُہن کی آزمائش ہے

۲۲۷

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مُجھ سے
جَفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مُجھ سے
خدایا! جذبۂ دِل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کِھنچتا جائے ہے مُجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر وہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے
ہُوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مُدّعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۲۸

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مِرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے
اِک کھیل ہے اورنگِ سُلیماں مِرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مِرے آگے
جُز نام نہیں صُورتِ عالم مجھے منظُور
جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مِرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مِرے ہوتے
گِھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مِرے آگے

گو ہاتھ کو جُنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مِرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو؟ اچّھا مِرے آگے

۲۲۹

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدّعا کہیے"
تمہیں کہو کہ جو تم یُوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم "سِتمگر ہیں"!
مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دِل میں جب اُتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جَراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دِل کُشا کہیے
جو مُدّعی بنے، اُس کے نہ مُدّعی بنیے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خُوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مَرحبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانئ روش و مستئ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبئ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا، ستم و جورِ ناخدا کہیے

۲۳۰

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۲۳۱

ہم نشیں مت کہہ، کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۲۳۲

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سُخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طُرّۂ لیلا کرے کوئی
رونے سے، اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دِل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پُرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گُل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
سَر بَر ہُوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ دَرد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
حُسنِ فروغِ شمعِ سُخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گُداختہ پیدا کرے کوئی

۲۲۳

ابنِ مَریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دَوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مَدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر وَاں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جُنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کِس کی حاجت رَوا کرے کوئی
کیا کیا خِضر نے سکندر سے؟
اب کِسے رہنما کرے کوئی
جب توقّع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کِسی کا گِلہ کرے کوئی!

۲۳۴
بھوکے نہیں ہیں سَیرِ گُلستاں کے ہم وَلے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہَوا ہے بہَار کی

۲۳۵

ہَزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نِکلے
بہت نِکلے مِرے اَرمان لیکن پھر بھی کم نِکلے
نِکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرُو ہو کر ترے کوچے سے ہم نِکلے
بھَرم کھُل جائے ظالم تیرے قامت کی دَرازی کا
اگر اِس طُرّۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نِکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نِکلے
ہوئی اِس دَور میں منسُوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جَم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی دَاد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نِکلے
محبت میں نہیں ہے فرق مَرنے اور جِینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دَم نِکلے
کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں وَاعظ
پَر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نِکلے

۲۳۶

صد جلوہ رُوبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خَم
اے خانماں خراب، نہ احساں اُٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

۲۳۷

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلّف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رِہا ہو جائیے

۲۳۸

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بَر ہَوس ہائے جہاں دامن فشانی مُفت ہے
یک نفَس، ہر یک نفَس جاتا ہے قسطِ عُمر میں
حَیف ہے اُن کو جو کہویں "زندگانی مُفت ہے"

۲۳۹

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گُل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

۲۴۰

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۲۴۱

قُمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو!
معشوقی و بے حوصلگی طُرفہ بلا ہے
مجبُوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گُناہوں کی بھی حسرت کی مِلے داد
یارب! اگر ان کردہ گُناہوں کی سزا ہے
بیگانگیٔ خلق سے بے دِل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خُدا ہے

۲۴۲

دل تو ہو، اچھا، نہیں ہے گر دماغ   کچھ تو اسبابِ تمنّا چاہیے

۲۴۳

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی
قسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظہُور کی
اِک خُونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہُور کی
آمد بہار کی ہے جو بُلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیُور کی
گو واں نہیں یہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو مِلے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۲۴۴

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گُلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یُوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تِیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ رِیائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلُودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے اِبرام بہت ہے
خُوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۲۴۵

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دَم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفَس
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پُرسشِ جراحتِ دِل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دِل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دِل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ خیال کا ساماں کیے ہوئے

دِل پھر طوافِ کوئے مَلامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیئے ہوئے
دَوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صَد گلُستاں نگاہ کا ساماں کیئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دِلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عُنواں کیئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہَوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزُو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیئے ہوئے
اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مَے سے گلُستاں کیئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دِن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیئے ہوئے
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے ٭ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیئے ہوئے

نویدِ امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم مَیں نے پاسباں کے لیے
بہ قدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی، تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

زمانہ، عہد میں اس کے، ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیئے
وَرق تمام ہُوا، اور مَدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لیئے
اَدائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سَرا
صَلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیئے

۲۴۷

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست، جو ساتھ مرے تالبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حَرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں
لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
سامنا حُور و پَری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دِلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نوّابؔ سے بھی مل آئے

۲۴۸

گدائے طاقتِ تحریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
اسدؔ طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

۲۴۹

لطفِ عشقِ ہر یک، اندازِ دگر دکھلائے گا
بے تکلّف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے

۲۵۰

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

۲۵۱

جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم بیمودہ ہے

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مُو حالِ دل پُرسیدنی جانے

۲۵۳

اسد وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلّق ہیں
صنوبر گلستاں میں با دلِ آزادہ آتا ہے

۲۵۴

اسد جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

۲۵۵

جوشِ جُنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

روز اس شہر میں اِک حُکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا؟ ٭ دل لیجئے مگر مِرے ارماں نکال کے

عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے
دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے ٭

◆

اسدؔ، بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

◆

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

◆

قطعات

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے، ہمنشیں
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مُطَرّا کہ ہے غضب!
وہ نازنیں بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر!
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ!
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

◆

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی؟ جانے دو، مِل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں: "کیوں، ہم نہ کہتے تھے؟"

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

○

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عَدیل
تیرا اقبالِ تَرَحّم، مرے جینے کی نوید!
تیرا اندازِ تغافل، مرے مَرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اَماں
چرخِ کجباز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں، گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے، بُنِ ناخنِ تدبیر میں، کیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے اَبہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مِری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مِری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اَماں، عُقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

○

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پشت سے، ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ، شاعری، ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں، اور مِرا مَسلک ہے صُلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عَداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظَفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے، پَرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مَجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نُما ہے، شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
مَیں کون اور ریختہ؛ ہاں، اس سے مدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا، ز رہِ امتثالِ اَمر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُو سیاہ!
سودا نہیں، جُنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ، خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

○

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اِک بینوائے گوشہ نشیں   تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
رُوشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ، از روئے ننگِ بے ہُنری
ہوں خود اپنی نظر میں اِتنا خوار

کہ گر اپنے کو مَیں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے، یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر!
نِسبتیں ہو گئیں مشخّص، چار

نہ کہوں آپ سے، تو کس سے کہوں؛
مدّعائے ضروریُ الاِظہار

پیر و مُرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے، آخر
تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؛
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!

آگ تاپے کہاں تلک انساں!
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار!

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار!

میری تنخواہ جو مقرّر ہے
اُس کے مِلنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے، مُردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا، ہے اِسی چلن پہ، مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات   اور چھماہی ہو سال میں دوبار!
بسکہ لیتا ہوں، ہر مہینے، قرض   اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں چہارم کا   ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں   شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیئے   ہے، زباں میری، تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے   ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظُلم ہے، گر نہ دو سُخن کی داد   قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!   آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ   تا نہو، مجھ کو، زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام   شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

* * *

نصرتُ المُلک بہادر، مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر، تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مِری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نِسبت اِک گونہ، مِرے دِل کو، ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے، توسنِ دولت کی عِناں!
یہ دعا شام و سحر، قاضیِ حاجات سے ہے
تُو سکندر ہے، مِرا فخر ہے مِلنا تیرا
گو، شرف خضر کی بھی مجھ کو، ملاقات سے ہے
اس پہ گزرے نہ گماں رِیو و رِیا کا زنہار!
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صَفَر، چلو
رکھ دیں چمن میں، بھر کے مئے مُشکبو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیئے، اور ہو کے مَست
سَبزے کو روندتا پھرے، پھُولوں کو جائے پھاند

افطارِ صوم کی کچھ، اگر، دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے؟

○

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے،
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

○

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

○

خامے کا صفحے پر رَواں ہونا
شاخِ گُل کا ہے گُلفشاں ہونا
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے اَرماں؟
آئے، یہ گوئے اور یہ میداں!
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے، تاک
نہ چلا، جب کسی طرح، مقدور
بادۂ ناب بن گیا، انگور
یہ بھی، ناچار، جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے؟
آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟
نہ گل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں؟
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟
جان میں ہوتی، گر، یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی،
جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یُوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یُوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ اَزل میں، مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں، سربمُہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل
ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس!

آم کو دیکھتا اگر یک بار   پھینک دیتا طلائی دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا   نازشِ دُودمانِ آب و ہَوا
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم   ناز پروردۂ بہار ہے آم

◆

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج   ہر سلحشُور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زَہرہ، ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے   گھر، بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک   تشنۂ خوں ہے، ہر مُسلماں کا
کوئی وَاں سے نہ آسکے یاں تک   آدمی، واں نہ جا سکے، یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؛   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جَل کر کیا کیے شکوہ   سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیئے باہم   ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مِٹے دل سے داغ ہجراں کا

ایک اہلِ دَرد نے سُنسان جو دیکھا قفس
یُوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟

بال و پَر دو چار دِکھلا کر، کہا صیّاد نے:
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب!"

○

مسلمانوں کے میلوں کا ہُوا قُل پُجے ہے جوگ مایہ اور دیبی
نشاں باقی نہیں اب سلطنت کا مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

○

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبّت کا ہے وُفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہُوا ہے اِسی مُلک سے ظہُور
ہے اصلِ تخم ہند سے، اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

○

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دِلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

سوا اناج کے، جو ہے مقلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہُوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ "کل کیا پکائیں"؟
وہ کھٹّے، کہاں پائیں، اِملی کے پھُول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو، اس کو، کیا، کھا کے ہم حظ اُٹھائیں؟

* * *

ہند میں اہلِ تَسَنّن کی ہیں دو سَلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم
رامپور، اہلِ نظر کی، ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہَشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دُور ہے، اِس مُلک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں، تو کم
رامپور آج ہے وہ بُقعۂ معمُور کہ ہے
مَرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

رامپور ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال،
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خُرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں، دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مُدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غُلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا، عالم
اوّلاً، عمرِ طبیعی بدوامِ اقبال
ثانیاً، دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قصائد

دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں؟

بے دِلی ہائے تماشا، کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا، کہ نہ دُنیا ہے، نہ دِیں
ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں
عشق، بیربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں
کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بیستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کِس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کِس نے پایا، اثرِ نالۂ دِل ہائے حزیں؟
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں
کِس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ "لاحول" لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر! "یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں!

○

ہاں، مہِ نو، سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تُو، جُھک کے، کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صُبح
یہی انداز اور یہی اندام
بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام
اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دَام
عُذر میں، تین دِن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُس کو بھُولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جاوے اور آوے شام
ایک مَیں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟
جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں،
ایک ہی ہے اُمید گاہِ اَنام!
مَیں نے مانا کہ تُو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا، مگر نہیں ہے، غلام؟
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بَن، ماہتاب بَن، مَیں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام؟
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اَور کے لین دین سے کیا کام؟
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص؛
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا، اِک بلوریں جام
پھر غزل کی روِش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
مَے ہی پھر کیوں نہ مَیں پیے جاؤں؛   غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؛ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دَیر میں اِحرام
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے   کیوں رکھوں، ورنہ، غالب اپنا نام؟
تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سُن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلالِ والاِکرام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے   صفحہ ہائے لیالی و ایّام
اور اُن اوراق میں، بکلکِ قضا   مجملاً مندرِج ہوئے احکام
لِکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کُش"   لِکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"
آسماں کو، کہا گیا کہ کہیں: "گنبدِ تیز گردِ نیلی فام"
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں: خال کو "دانہ" اور زُلف کو "دام"
آتش و آب و باد و خاک نے لی   وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز"   ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"

تیرے توقیعِ سلطنت کو بھی   دی، بدستور، صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم،   اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو اَبد تک رسائیٔ انجام!

○

صُبحدم، دَروازۂ خاوَر کھُلا   مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے، آیا، صَرف میں   شب کو تھا، گنجینۂ گوہر، کھُلا
وہ بھی تھی اِک سیمیا کی سی نمود   صُبح کو، رازِ مہ و اختر کھُلا
ہیں کواکِب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا، یہ بازیگر، کھُلا
سطحِ گردُوں پر پڑا تھا، رات کو   موتیوں کا، ہرطرف، زیور کھُلا
صُبح آیا، جانبِ مشرق، نظر   اِک نگارِ آتشیں رُخ سَر کھُلا
تھی نظربندی، کیا جب رَدِّ سحر   بادۂ گُلرنگ کا ساغر کھُلا
لا کے، ساقی نے، صبوحی کے لیئے   رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا
بزمِ سُلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اَماں کا دَر کھُلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا   خُسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے   رازِ ہستی اُس پہ سَرتاسَر کھُلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نُہ چرخ و ہَفت اختر کھُلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے   عُقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا
پہلے دارا کا، نکل آیا ہے، نام   اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا
رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے   واں لکھا ہے چہرۂ قیصر، کھُلا
تھا، دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید   کِس نے کھولا؟ کب کھُلا؟ کیونکر کھُلا؟
باغِ معنی کی، دکھادوں گا، بہار   مجھ سے، اگر، شاہِ سخن گستر کھُلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی، نفَس   لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا
کُنج میں بیٹھا رہوں، یُوں پَر کھُلا   کاشکے ہوتا قفس کا دَر کھُلا
ہم پکاریں اور کھُلے، یوں کون جائے؟   یار کا دروازہ پاویں، گر، کھُلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھَمنڈ   دوست کا، ہے، راز دشمن پر کھُلا
واقعی، دل پر بَھلا لگتا تھا داغ   زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھُلا
مُفت کا، کِس کو بُرا ہے بَدرَقہ   رہروی میں، پردۂ رہبر کھُلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟   آگ بھڑکی، مینہہ اگر دَم بھر کھُلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مُرگ   رہ گیا، خط میری چھاتی پر، کھُلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

پھر، ہُوا مدحت طرازی کا خَیال   پھر، مہ و خورشید کا دفتر کھُلا
خامے سے پائی، طبیعت نے، مَدد   بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر، کھُلا

مدح سے ممدُوح کی دیکھی شکوہ   یاں عَرَض سے رُتبۂ جوہر کھُلا
مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا   بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب   اب، عُلُوِّ پایۂ منبر کھُلا
سکّۂ شہ کا، ہُوا ہے، رُوشناس   اب، عیارِ آبروئے زَر کھُلا
شاہ کے آگے دَھرا ہے آئنہ   اب، مآلِ سَعیِ اسکندر کھُلا
ملک کے وارث کو دیکھا، خلق نے   اب، فریبِ طُغرل و سنجر کھُلا
ہو سکے کیا مدح ؛ ہاں، اِک نام ہے   دفترِ مدحِ جہاں داوَر کھُلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام   عجزِ اعجازِ ستائشگر کھُلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ اَزل   تم پہ، اے خاقانِ نام آوَر کھُلا
تم کرو صاحب قرانی، جب تلک   ہے طلسمِ روز و شب کا دَر کھُلا

○

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
دکھا کے رشتہ، کسی جوتشی سے پُوچھا تھا
کہ "دیکھ کتنی، اُٹھا لائے گا یہ تار گرہ"؛
کہا کہ 'چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے، تو پا دیں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر نثار گرہ
اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نو بہار گرہ
اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار گرہ
اُنھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں، گہر ہائے شاہوار گرہ
اُنھیں کی سالگرہ کے لیئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار گرہ

* * *

مرحبا! سالِ فرخی آئیں   عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز   لیک، بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو، اس اکیس دن میں، ہولی کی   جا بجا، مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں، کو بکو، عبیر و گلال   باغ میں، سو بسو، گل و نسریں
شہر، گویا، نمونۂ گلزار   باغ، گویا، نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب   جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں　　منعقد، محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب　　رونق افزائے مسندِ تمکیں

○

کرتا ہے، چرخ، روز بصد گونہ احترام
فرماں رَوائے کشورِ پنجاب کو، سلام
حق گوی و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک، جس سے ہوا، بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو، جگر
کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام
وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم
لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستّر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام

عزّت پہ، اہلِ نام کی ہستی کی، ہے، بنا
عزّت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے، انتقام
اَمرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا، چاہیئے، قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزّت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِّ شعر یہی ہے، قدیم سے
یعنی، دُعا پہ مدح کا، کرتے ہیں، اختتام
ہے یہ دُعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اِقلیمِ ہند و سندھ سے تا مُلکِ رُوم و شام!

سہرا

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سَر سہرا
باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر، سہرا
کیا ہی اس چاند سے مُکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور، سہرا
سَر پہ چڑھنا تجھے پھَبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا
ناؤ بھر کر ہی، پروئے گئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو، گرمی سے، پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گُہر بار، سراسر، سہرا
یہ بھی اِک بے اَدبی تھی کہ قبَا سے بڑھ جائے
رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اِک چیز،
چاہیے، پھُولوں کا بھی ایک مُقرّر، سہرا

جب کہ اپنے میں سمادیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھُولوں کا، بھَلا پھر کوئی کیونکر، سہرا؟
رُخِ روشن کی دَمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ کہلا دے فُروغِ مہ و اختر، سہرا؟
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباری گوہر، سہرا؟
ہم سُخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اِس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

رُباعیات

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سُخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
"گویم مشکل، وگر نگویم مشکل"

دُکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالبؔ
دل رُک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہوگیا ہے غالبؔ

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مِرا ایمان ہے غالبؔ، لیکن
خس خانۂ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

انتخاب

کلامِ فارسی

قطعات ص ۵/۱۵ زُنّاری، ہراس کنم ۵، فرہ مندیم ۶ خمَسبت، بودہ است، بُردست، زبانِ اوست،
ترکیب بند (جبسیّہ) ہمسنگ منست، سرودی، پیالۂ من ۸، ولائی تو من، غزہ، دودمانِ منست ۱۰
پلیدش گویند، مال ۱۱، تذلیل، ترخوشست، عزیز تر باشد، زن ۱۲، ہفت ایواں ۱۳، انشاکردہ است
مثنویات ص ۱۸/۴۰ چراغ دیر (۳) ص۲۰، رنگ وبو (۴) ص۲۲ بادِ مخالف (۵) ص۲۳ بیان نمود اری شان نبوتؐ
ولایت (۶) ص۲۶ تقریظ آئین اکبری (۱۰) ص۲۷، ابرگہربار (۱۱) ۲۹
قصائد ص ۴۱/۵۸ گماں انداختہ، شاہدان بازاری ۴۱، طرۂ بہار، سمعنا واطعنا ۴۲، حرم را، زیاں دہد ۴۳، جبہہ
تسلیم ۴۴، بہادر شاہ ۴۵، شہریار گرہ، ایماں برابرست ۴۶، بزم آراست ۴۷، ماہ رمضاں، جانے دارد ۴۸، ثریا
بیند ۴۹، غماز جاں دہد ۵۰، روزگار یافت، نیاز ۵۱، کجائی، دامان منست ۵۲، پنجاب، جنباں فرستم ۵۳، کر د روزگار،
ایواں آمد ۵۴، زہر دیار، می زنم ۵۵، فردائے من، برادر من ۵۶، داستاں نگویم، نمی خواہم، بیشتر گویم ۵۸
غزلیات ص ۵۹/۱۳۹ باماجرا، فغاں را، غربالِ ما، دستار ما، ۵۹، کندمارا، آئینۂ ما، آنست مرا، پیراہن ما ۶۰، لبستہ ایم ما
خودیم ما، کوکبہا، نمائی ما، ۶۱ فریفت مرا، انتظار بیا، نام را ۶۲، سلیمانی مرا، قلزمیم ما، دوچار ما، دلستانی را، قفس ما ۶۳، باراں را،
قبالۂ ما، تنگش را، گوئیم ما، ننگ را، گلاب را، ہجراں را، اوراکشت ما ۶۵، پائے را، کجلاہی را، دیوانۂ ما، تیز گاماں را ۶۶،
آتاں را، دریاب، چہ عجب، ۶۷، اِمشب، مُحتسِب ۶۸، وانیست، افتادہ است، نگاہ کیست ۶۹، ہمنشینیست، نمکست،
زباں تونیست، فاست ہست، ۷۰، آتشست، بازارست، آبست، ندانست، ۷۱، خانہ الیست نخواست، نازکست ۷۲،
روانی ہاست، نماندہ است، بلندنیست، بیش نیست ۷۳، ساایست، می بابست، نکشودن رفت ۷۴، پیداشت، بودہ است،
آمد ورفت، شدہ است ۷۵، استخوانم سوخت، سخن لبیت، دربنداست ۷۶، مری گرفت، دہان نیست، نتواں گفت ۷۷،
فرو ریخت، نداشت، توکیست، خفتست ۷۸، زبردست، سوخت، یتیم ست ۷۹، بجام چیست، جستجو گرفت،
جوابے ہست ۸۰، افتادست، دستارہست، ترست، عربیست ۸۱ زمانۂ تست، دریں چہ بحث ۸۲، چہ احتیاج،
مسیخ، زبان ہیچ، ہیچ ۸۳، دم صبح، طرح، گستاخ، ندہد ۸۴، ماریزد، افتاد، بامی دہد، ویران شد ۸۵، صبا می آید،

ہم ندارد ۸۶، نشانم دادندگاں برخیزد ۸۷، نشناسد، بجُنبد، دلستاں رسد ۸۸، می رُود، ضرور بود، خروشش آمد،
باید بود ۸۹، بدر آورد، دلرزد ۹۰ فرو کنند، چہ می رود، بر نمی آید، میدہم نمی آید ۹۱، تو شود، خداداد آمد ۹۲، پہلوئے تو بود،
ماند، نکو بُرد، نداند ۹۳، فرو ریزد، سفر گزرد، حرام شد، نہ رسد، ندارد ۹۴، وفا ندارد، می زند، گفتہ اند، نقاب زدہ ۹۵، افگند
باشد، آواز دہد، بُرد، پنہاں می رود ۹۶، شام ندارد، جاں نبود، نیز کنند، ایمنی دارد ۹۷، رہزنم باشد، بُرد، علم کشد،
آشکار بُرد ۹۸، آواز ندارد، مبادا می رسد، بسیار ماند ۹۹، کمیں باشد، چہ کاری کرد، ساربان دارد، خوش نکرد، چندش
بود ۱۰۰، آفریں گوید، تبر زد، غم گردد ۱۰۱، چہ رود داد، بگرداند، شنیدہ باد، نکردند ۱۰۲، بغاوت نہ رود، ہوشیاراں بر، بہار،
نیگر ۱۰۳، یاد آر، بسر بر، بمن آر، ہوش آور ۱۰۴، تمناکش نگر ۱۰۵، نظم ریز، برخیز، ہنوز، شناس ۱۰۶، نکردہ کس، خاموش، خسش،
آتش ۱۰۷، نامیدش، گفتارش، گوہرکش ۱۰۸، برقص، دہد عوض ۱۰۹، شرط، غلط، چہ خط، خبر چہ خط ۱۱۰، شمع، جمع ۱۱۱ دروغ،
دریغ، تلف، یکطرف ۱۱۲، رفیق، شوق، ہلاک، چہ باک ۱۱۳، اندک، ہمہ تنگ، چو خلیل، از دل، در بغل ۱۱۴، کوئے گل، ساحل، افگنم
۱۱۵، سحرگاہیم، کردہ ایم، خودم ۱۱۶، داشتم، سر داشتم، برابر دارم، شستہ ایم ۱۱۷، تکرارش کنم، گرفتہ ایم، نوشتہ ایم، آدم افگنم ۱۱۸، اثر اہم،
افتادہ ام، کردہ ام، می کنم ۱۱۹، بنمائم، باشم، می خواہم، آستیں دارم ۱۲۰، بگردانیم ۱۲۱، خواستیم، پوشم، داشتہ ایم کنم ۱۲۲، رمیدن
ہم ندارم، ندانم، بازافگنم ۱۲۳، ترکن، ہم شاں کشتن ۱۲۴، خواہم شدن، کشیدن، سیمائے من، زیستن ۱۲۵، کرم داشتن، ناز کردن،
۱۲۶، تواں کردن، شناختن، خواہد شدن ۱۲۷، جہانے بشنو ۱۲۸، خیزد از و، کو مسلماں شو ۱۲۹، کشودہ، کردہ، زدہ، نہادہ ۱۳۰،
پنداری، چہ غمستے، باری یکے ۱۳۱، نشانستے، کوتہ قبائے ۱۳۲، داشتی داری، دشواری ۱۳۳، کردے رامانی، نہ دہی ۱۳۴، قبائی،
تواں ہائے سیلاب کجائی ۱۳۵، آزردہمی، آزری، ستے ۱۳۶، ہم آبلئے، کردار توانا، جام ما ۱۳۷، اہتہ نا پایا ہوتا کے، گوئندہ ۱۳۸،
دمُ، کوتاہ، نبود ۱۴۰، آہنگ زند، ببرد، پیوند نبود، داری، خویش چہ نشاط ۱۴۱،

رباعیات ص ۱۴۰ ۱۴۶

بخشند، زہر، باہم دہ فرات، ہمہ عمر دارد ۱۴۲، جداست، داشتہ است، بر دُود،
آید پیش، کوثر نیست، دام گشت ۱۴۳، مرجع عام نجاست، منوالست، دایم، بیا، خدو خال، ۱۴۴، تواں بودن
ہمہ عمر پہ دائے ماحوالست گزشت، بودے ۱۴۵، آسمانی مایم، زر زندہی ۱۴۶،

قطعات

مسنج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی   مشو اسیرِ زلالی کہ بود خوانساری
بسومناتِ خیالم درآی تا بینی   روان فروز بَرو دوشہای زنّاری
(اقتباس از قصیده دوم در نعت)

قطعۂ

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش   از فسونِ کسے ہراس کنم
نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ   عالمی را خدا شناس کنم
نہ کہ اخبار پاستانے را   دیو افسانہا قیاس کنم
نہ کہ ز آثار ہرچہ مشہورست   اثری تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہر حلّہ ہائے بہشت   ترکِ آرایشِ لباس کنم
نہ کہ در عالم فراخ روی   عار از ژندۂ پلاس کنم
چون نہ من ساقیم نہ محتسبم   نہ بریزم نہ مے بکاس کنم
نہ بواجب ز سعے در مانم   نہ بہر مدعا مکاس کنم
بر مدارا اگر مدار نہم   کاخِ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید ز من کہ در گفتار   مدحتِ لالہ سوَرداس کنم
فصلی از مدح خود توانم خواند   گر نہ لب را ز لاف پاس کنم
خوشنوایم مرا رسد کہ ز رشک   زہر در جامِ بُو نواس کنم

میتوان پنجہ از نطاقے بُرد   پارۂ جمع گر حواس کنم
توسنِ طبع مَن بدان اَرزد   کہ ز بالِ پری قطاس کنم
مزرعِ خویش را بگاہِ دِرَوْ   ناخنِ حور صرفِ داس کنم
ہمچو سرو از غم خزان برہد   گلبنے را کہ من مساس کنم
کوثر از موج واکند آغوش   اگر اندازِ ارتماس کنم
چہ ازین فرقۂ ادانشناس   خویشتن را ہلاک یاس کنم
بد و نیکی ز گفت ہای حزین   صفحہ را طُرّۂ ایاس کنم
"لائق مَدح در زمانہ چو نیست   خویشتن را ہمی سپاس کنم
کس زبانِ مرا نمے فہمد   بعزیزان چہ التماس کنم"

قطعہ

غالبؔ از خاک پاک تورانیم   لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے   بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک   در تمامے ز ماہ دہ چندیم
فن آبائی ما کشاورزیست   مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنے سخن گزاردۂ   خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم   عقلِ کُل را بہینہ فرزندیم
ہم بتابِش بَرق ہم نفسیم   ہم بہ بخشش بَاَبر مانندیم

بتلاشیکہ ہست فیروزیم   بمعاشیکہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمیگرییم   ہمہ بر روزگار می خندیم

قطعۂ

ساقی چو من پشنگے و افراسیابیم   دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم ست
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار   زین پس رسد بہشت کہ میراث آدم ست

قطعۂ

دل اگر خاست باید کز فشردن نم دہد   ویں بریزش نسبت دو رو درازی بودہ است
اینکہ افشارند و نم گیرند مشقی بیش نیست   دینکہ خود خون گردد و ریزد گدازی بودہ ست

قطعۂ ۵

ہزار معنیِ سرجوش خاص نطقِ من ست   کز اہلِ ذوق دل و گوئی از عسل بُردست
ز رفتگان بیکے گر تواردم رو داد   مدان کہ خوبیِ آرائشِ غزل بُردست
مراست ننگ ولی فخر اوست کان بسخن   بسعیِ فکرِ رسا جا بدان محل بُردست
مبر گمانِ توارُد یقین شناس کہ دُزد   متاعِ من ز نہان خانۂ ازل بُردست

قطعۂ ۶

غالب درین زمانہ بہر کس کہ وارسی   مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اُوست
زین مایہ از کجا کہ بنالد بخویشتن   ہر گنج شایگان کہ بود رائیگان اُوست
کس را ز دست بردِ خیالش نجات نیست   گر پیش از گذشتہ و گر در زمان اُوست

جُز من کسی بدزدِ سُخن وانمی رسد
گو خوش بخوان کہ انجمنی مَدح خوان اُوست

آری نہ "چک" بود نہ تمسک زہر کہ ہست
نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشان اُوست

مضمونِ شعر "نوٹ" بود فی زماننا
یعنی بدستِ ہر کہ بیفتاد آن اُوست

قطعۂ ۷

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سُخن رس گفتۂ
کی بُرِ گوئی فلان در شعر ہمسنگ منست

راست گفتی لیک میدانی کہ نبُوَد جائی طعن
کمتر از بانگِ دُہل گر نغمۂ چنگ منست

نیست نقصان یکدو جزوست ار سوادِ ریختہ
کان دُژم برگی ز نخلستان فرہنگ منست

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ منست

کی درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلے آئینہ ام این جوہر آن زنگ منست

دشمنی را ہمفنی شرطست و آن دانی کہ نیست
از تو نبُوَد نغمہ ور سازی کہ در چنگ منست

راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید
ہر چہ در گفتار فخرِ تست آن ننگ منست

قطعۂ ۸

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنّی و شرابی و سُرودی

زنہار ازان قوم نباشے کہ فریبند
حق را بسجُودی و نبیؐ را بدُرودی

قطعۂ ۱۰

ساقیِ بزمِ آگہی روزے
راوقے ریخت در پیالۂ من

چون دماغم رسید زان صہبا
شدم از ترکتازِ وہم ایمن

گفتم ای "محرم سرائے سرور"   از ادب دور نیست پرسیدن
اول از دعوئے وجود بگو   گفت کفرست در طریقت من

گفتم آخر نمود اشیا چیست   گفت ہی ہی نمیتواں گفتن
گفتمش با مخالفان چہ کنم   گفت طرح بنائے صلح فگن
گفتم ایں حب جاہ و منصب چیست   گفت دام فریبِ اہرمن
گفتمش چیست منشاءِ سفرم   گفت جور و جفائے اہل وطن
گفتم اکنون بگو کہ دہلی چیست   گفت جانست و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت   شاہدی مست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد   گفت رنگیں تر از فضائی چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد   گفت خوشتر نباشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت   باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد در وے   گفت از ہر دیار و از ہر فن
گفتم اینجا چہ شغل سود دہد   گفت از ہر کہ ہست ترسیدن
گفتم اینجا چہ کار باید کرد   گفت قطع نظر ز شعر و سخن
گفتم ایں ماہ پیکران چہ کس اند   گفت خوبانِ کشور لندن
گفتم ایشان مگر دلے دارند   گفت دارند لیکن از آہن
گفتم از بہرِ داد آمدہ ام   گفت بگریز و سر بسنگ مزن

گفتم اکنون مراچہ زیبد گفت   آستین بر دو عالم افشاندن
گفتمش باز گو طریق نجات   گفت غالبؔ بجز بلا رفتن

قطعہ ۱۲

ای کہ خواہی کہ بعد ازیں باشم   مخلص صادق الولائی تو من
گر ترا شیوہ شاہدے بودے   کردمی جان و دل فدائی تو من
ور ترا پیشہ شاعرے بودے   سودمی چشم و سر بپائی تو من
در ترا پایہ خسروے بودے   سُفتمے گوہر ثنائی تو من
چوں ازینہا نہ مراچہ ضرور   کہ شوم ہرزہ مبتلائی تو من
بسکہ برمال و جاہ مغرورے   نیستم خوش ازیں ادائی تو من
بتو ہرگز ندادے زر و سیم   خواجہ گر بودے خدائی تو من

قطعہ ۱۸

چون الف بیگ در کہن سالے   پسری یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے   الف مُنحَنی بود ہمزہ

قطعہ ۲۶

آن پسندیدہ خوئی عارف نام   کز رخش شمع دودمانِ منست
آنکہ در بزم قرب و خلوتِ اُنس   غمگسار مزاج دان منست
زور بازوئے کامرانیِ من   راحتِ روحِ ناتوان منست

ای کہ میراث خوار من باشے   اندر اُردو کہ آں زبان منست
از معانے زمبدءٔ فیاض   باد آنِ تو ہر چہ آنِ منست

قطعہ ۱۳

دیدی آن بدگہر و مہر و ولایش بہ یزید   کہ بخشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
زان کہ او خود بسرِ ابنِ علی تیغ نزاند   خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند
گفتم البتہ کہ شبّیر بدان می اَرزد   کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زان رو کہ عزیزان ہمہ مُسلِم بودند   نتوان کرد گوارا کہ شہیدش گویند

قطعہ ۱۴

ہفت گنجینۂ پرویز نہ سنجم بدو جو   تشنۂ بادۂ نابم نہ گدا پیشۂ مال
چُون عطای تو بود پاک ز تحریم چہ باک   مَی حرامست ولی میخورم از وجہِ حَلال
انچہ میخواہم ازین توطیہ دانے چہ بُوَد   کنجی از باغ و خمی از مَی و جامی ز سفال
بستہ بر غیر درِ کلبہ و بر نظم طراز   رُفتہ از زاویہ خاشاک و ز دل گردِ ملال
گہ دران گوشہ ز خود رفتہ و گاہی ہشیار   گہ در اندیشہ غزل سنج و گہی مَدح سگال
گہ ز اسرارِ ازل یافتہ در سینہ نشان   گہ ز آثار خرد ریختہ بر صفحہ لآل
چون شود شام نہم شمع فروزندہ بہ پیش   از درخشندگیِ جوہرِ عقلِ فعّال

دارم اُمیّد کہ غالبؔ اگرش عمر بود
ہم بدین سان گزراند شب و روز و مہ و سال

قطعہ[۲۴]

بہ آدم زن بشیطان طوق لعنت   سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم   گران تر آمد از طوقِ عزازیل

از مجموعۂ سبد چین

نوروز و مہرگاں نبود در طریق ما   اما شگفتہ روئی گلہائے تر خوش است
نوروز عید نیست بہار ست و در بہار   آئین شادمانی و ذوق نظر خوش است
از باد زمہریر بہ گیتی نشاں نماند   جوشِ گل و نشاطِ نسیم سحر خوش است
دریا خوش و شراب خوش و کوہسار خوش   منزل خوش است توشہ خوش است و سفر خوش است
اینہا خوش است و بہر تو آوردہ روزگار   ہم بہر تست ہر چہ ازیں بیشتر خوش است

قطعہ[۱۰]

جان عزیز است و اہل عزت را   عزت از جاں عزیز تر باشد
خود بفرما چساں تواند زیست   ہر کرا ہر دو در خطر باشد

قطعہ[۲۱]

گیر کہ در روز حشر چوں تو بہ نفتی   بر سرِ دوزخ نہند تیرہ نہنبن
داں کہ نباشد دراں مضیق مصیبت   در طلب نان و جامہ کشمکش از زن

داں کہ نباشد دراں مقامِ صعوبت   شورِ تقاضائے ناروائے مہاجن

قطعہ ۲۷

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس   کائے شمع و چراغ ہفت ایواں
آیا ز چہ رُو بود کہ نواب   ننوشت جواب نامہ ام ہاں
عقلم بجواب گفت غالبؔ   زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بفکرِ ارمغانست   تا نامہ فرستدت بساماں
زود است کہ جمع نیز گردد   دیر است کہ دادہ است فرماں
تا راہ روانِ بحر و بر گرد   آرند بکوششِ فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از رُوم   الماس ز معدن و زر از کاں
فیل از دکن و نوَرد از کوہ   توسن ز عراق و دُر ز عمّاں
فیروزۂ نغز از نشاپور   یاقوتِ گزیدہ از بدخشاں
جَمّازہ تیز رو ز بغداد   شمشیرِ برندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر   زربفت گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست   بر رنج و ملال نیست برہاں
گفتم کہ چوں بامن ایں کرم کرد   آں قبلۂ و قبلہ گاہِ اعیاں
من نیز طلب کنم برایش   ایں خواہش اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر   انگشتر و تخت از سلیماں

از عالمِ غیب جامِ جمشید   از چشمۂ خضر آبِ حیواں
عمرِ ابد و نشاطِ جاوید   نیروئے دل و ثباتِ ایماں
توفیق جواب نامۂ خویش   توقیع عطا و بذل احساں

قطعہ ۲۶

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ   در خصوصِ گفتگوئے پارس انشا کردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد بلے   ننگ دارد علم از کاریکہ آغا کردہ است
انتقامِ جامعِ "برہانِ قاطع" می کشد   آنچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت   ولے بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام   شوخیٔ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است

قطعہ ۱۹ در مدح گربۂ خود (از کلیات)

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے   کز بال پریزاد بود موج رمِ او
چوں صورت آئینہ ز افراطِ لطافت   آید بنظر بچۂ او از شکم او
جوشِ گل و بالیدگیِ موجۂ نکہت   دُم لابہ کناں آمدنِ دمبدم او
در عربدہ چوں بند ز دُم باز کشاید   لرزد شکنِ طرّۂ خوباں ز خمِ او
تا مہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر   بادا کفِ دستِ من و پشت و شکم او

ترکیب بند

تصنیف ۱۹۴۲ء که در کلیات نظم فارسی شریک نبوده

خواہم از بند بزنداں سخن آغاز کنم   غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم
در خرابی بجہاں میکدہ بنیاد نہم   در اسیری بہ سخن دعوئ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید بشعر آویزم   روزکے چند رسن تابئ آواز کنم
ہلہ دزدانِ گرفتار وفا نیست بشہر   خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم
گرچہ توقیع گرفتارئ جاویدم نیست
لیکن از دہر دگر خوشدلی امیدم نیست
شمع ہر چند بہر زاویہ آساں سوزد   خوشتر آنست کہ بر نطع در ایواں سوزد
عودِ من ہرزہ مسوزید و گر سوختنی ست   بگزارید کہ در مجمرِ سلطاں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ روشن نشود در شبِ تار   جز بداں خواب کہ در چشمِ نگہباں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ در روئے تواں یافت ہوا   جز سمومے کہ خس و خارِ بیاباں سوزد
اے کہ در زاویہ شبہا بچراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری
پاسبانان بہم آئید کہ من می آیم   در زنداں بکشائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم و ز انبوہِ شما می ترسم   راہم از دور نمائید کہ من می آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید   بخت خود را بستائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است   بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیٔ من
غیر نشگفت خورد گر غمِ ناکامیٔ من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی   آفتاب از جہت قبلہ بر آمد گوئی
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع   خستگی غازۂ روئے ہنر آمد گوئی
خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غمخواریٔ من   رحمتِ حق بہ لباس بشر آمد گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے   پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر میرم چہ غم از مرگ عزادارِن است

خواجہ دانم کہ بسی روز نمانم دربند   لیک دانی کہ شب از روز ندانم دربند
شادم از بند کہ از بند معاش آزادم   از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم دربند
یارب ایں گوہرِ معنی کہ فشانم ز کجاست   بند بر دل بود و نیست زبانم دربند
خوے خوش بہر مصیبت زدہ رنجے دگر است   رنجہ از دیدنِ رنجِ دگرانم دربند

نیستم طفل کہ در بند رہائی باشم
ہم ز ذوق ست کہ در سلسلہ خائی باشم

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبوَد   چکنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبوَد

زیں دو سرہنگ کہ پویند بہم می ترسم   بیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود
ہمدماں دارم امید رہائی در بند   دامن از بعد رہائی تہِ سنگم نبود
جورِ اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن   طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

بہ صریر قلم خویش بود مستیٔ من
اندریں بند گراں بیں و سبکدستیٔ من

ہمدماں در دلم از دیدہ نہانید ہمہ   غالب غمزدہ را روح و روانید ہمہ
درمیاں ضابطۂ مہر و وفاے بودست   من بَرَینم کہ ہر آئینہ بر آنید ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانے چوں است   بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی ست   دل اگر نیست خداوند زبانید ہمہ

آں نباشم کہ بہ ہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

متفرق از ترکیب بند در منقبت

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستاں دیدہ ام   شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام
محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند   تا بجرم فہم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند
پایۂ من جز بچشم من نیاید در نظر   از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر
یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسوست   می رود سرمایہ از کف تا خریداری رسد
عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام   ہوشیارم با خداؤ با علی دیوانہ ام

مثنوی چراغِ دَیر (۳)

نفس با صور دمسازست امروز　　خموشی محشرِ رازست امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم　　کفِ خاکم غبارے می نویسم
پریشان تر ز زلفم داستانیست　　بدعوی ہر سرِ مُویم زبانیست
شکایت گونۂ دارم ز احباب　　کتانِ خویش میشویم بمہتاب
نفس ابریشم ساز فغان ست　　بسان نَے تَہَم دَر استخوان ست
ز دہلی تا برون آورده بختم　　بطوفان تغافل داده رختم
کس از اہلِ وطن غمخوار من نیست　　مرا در دہر پنداری وطن نیست
مگو داغِ فراقِ بوستان سوخت　　غمِ بیمہری این دوستان نیست
جہان آباد گر نبود الم نیست　　جہان آباد بادا جائی کم نیست
نباشد قحط بہر آشیانے　　سرِ شاخِ گلے در گُلستانے
بخاطر دارم اینک گُلزمینے　　بہار آئین سوادِ دل نشینے
سخن را نازش مینو قماشی　　ز گُلبانگِ ستایشہاے کاشی
تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور　　بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
بنارس را کسی گفتا کہ چینست　　ہنوز از گنگ چینش بر جبین ست

بخوش پرکاری طرز وجودش
ز دهلی میرسد هر دم درودش
بنارس را مگر دیدست در خواب
که میگردد ز نهرش در دهن آب
تناسخ مشربان چون لب کشایند
به کیشِ خویش کاشی را ستایند
که هر کس کاندران گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایهٔ اُمّید گردد
بمُردن زندهٔ جاوید گردد
زهی آسودگی بخشِ روانها
که داغِ جسم می شوید ز جانها
شگفتی نیست از آب و هوایش
که تنها جان شود اندر فضایش
بیا اے غافل از کیفیتِ ناز
نگاهی بر پری زادانش انداز
همه جانهای بے تن کن تماشا
ندارد آب و خاک این جلوه حاشا
درین دیرینه دیرستان نیرنگ
بهارش ایمن ست از گردشِ رنگ
چه فروردین چه دیماه و چه مرداد
بهر موسم فضایش جنت آباد
بهاران در شتا و صیف ز آفاق
بکاشی میکند قشلاق و ییلاق
بود در عرض بال افشانیِ ناز
خزانش صندل پیشانیِ ناز
به تسلیم هوائے آن چمن زار
ز موجِ گل بهاران بسته زنار
فلک را قشقه اش گر بر جبین نیست
پس این رنگینیِ موجِ شفق چیست
سوادش پای تختِ بُت پرستان
سراپایش زیارت گاه مستان
عبادتخانهٔ ناقوسیانست
همانا کعبهٔ هندوستانست

بُتانش را ہیولے شعلۂ طُور
سراپا نُور ایزد چشمِ بد دُور
میانہا نازک و دِلہا توانا
ز نادانی بکارِ خویش دَانا
ز رنگین جلوہا غارتگرِ ہوش
بہارِ بستر و نوروزِ آغوش
ز تابِ جلوۂ خویش آتش افروز
بُتانِ بُت پرست و برہمن سوز
رسانده از ادائی شست وشوئے
بہر موجے نوید آبروئے
بہ مستی موج را فرمُودہ آرام
ز لغزے آب را بخشیدہ اندام
ز بس عرضِ تمنّاے کند گنگ
ز موج آغوشہا وا میکند گنگ
مگر گوئی بنارس شاہدی ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست
بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شُد
بنارس خود نظیرِ خویشتن شُد
شبے پرسیدم از روشن بیانے
ز گردشہائے گردون رازدانے
ز ایمانہا بجُز نامی نمانده
بغیر از دانۂ و دامے نمانده
پدر ہا تشنۂ خُونِ پسر ہا
پسر ہا دشمنِ جانِ پدر ہا
برادر با برادر در ستیزہ ست
وفاق از شش جہت رو در گریز ست
بدین بے پردگیہائے علامت
چرا پیدا نمی گردد قیامت
سوئے کاشی باندازِ اشارت
تبسم کرد و گفتا این عمارت
کہ حقّا نیست صانعِ را گوارا
کہ از ہم ریزد این رنگین بنارا
بلند افتادہ تمکینِ بنارس
بُوَد بر اَوج او اندیشہ نارس

الا اے غالب کار اوفتادہ   زچشمِ یار و اغیار اوفتادہ
زخویش و آشنا بیگانہ گشتہ   جنون گل کردہ و دیوانہ گشتہ
چہ محشر سر زد از آب و گل تو   دریغا از تو و آہ از دلِ تو
چہ جوئی جلوہ زین رنگین چمنہا   بہشت خویش شو از خون شدنہا
چو بوئے گُل ز پیراہن برون آئے   بآزادی ز بند تن برون آئے
فرو ماندن بکاشی نارسائیست   خدارا این چہ کافر ماجرائیست
بکاشی لختی از کاشانہ یاد آر   درین جنت ازان ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن واماندۂ چند   بخون دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پائی در دامن شکستہ   بامید تو چشم از خویش بستہ
ہمہ در خاک و خون افگندۂ تو   بحکمِ بیکسیہا بندۂ تو
سر و سرمایہ غارت کردۂ تو   ز تو نالان ولے در پردۂ تو
از آنانت تغافل خوشنمانیست   بداغ شان ہوائے گل روانیست
ترا اے بیخبر کاریست در پیش   بیابانی و کہساریست در پیش
دل از تاب بلا بگداز و خون کُن   ز دانش کار نکشاید جنون کُن
نفس تا خود فرو ننشیند از پای   دمی از جادہ پیمائی میاسای
شرار آسا فنا آمادہ برخیز   بیفشان دامن و آزادہ برخیز

مثنویٔ رنگ و بو (۴)

غالبؔ افسردہ دل و جان بیا
بے سر و پا در صفِ رندان بیا
آن اثر پردۂ سازت چہ شد
زمزمۂ خارا گدازت چہ شد
دَر ہَوس جاہ فرو رفتۂ
حَیف کہ در چاہ فرو رفتۂ
تا پیٔ نیرنگ و فن افتادۂ
از نظرِ خویشتن افتادۂ
آہ ز دُنیا طلبیہاے تو
واین ہمہ ابرام و تقاضاے تو
گرمیِ خونت کہ ازین پیش بُود
صَرف بَرانداختن خویش بُود
آتش ہنگامہ بجان داشتے
داغ مغان شیوہ بتان داشتے
چشمِ پریشان نظرے داشتی
جلوہ بہَر رہگذرے داشتی
زان ہمہ اجزائے زمانیکہ رفت
وان ہمہ خونابہ فشانی کہ رفت
ہرچہ کنون میرسَدم در نظر
شاہد و شعر ست و شراب و شکر
آن ہمہ دیوانگی و جاہلی
وین ہمہ ناکامی و بیحاصلی
آن ہمہ بدمستی و تن پَروری
وین ہمہ شیّادی و افسونگری
آن ہمہ بیراہہ رویہاے تو
وین ہمہ بیصرفہ دویہاے تو
نیمہ شب از عمر تو در خواب رفت
نیمہ بہ پیمودن مہتاب رفت
بین کہ درین کارگہ پیچ پیچ
ماحصلِ سعیِ تو ہیچست ہیچ

نقد تمنا بکف افتادہ گیر   خسروی دست بہم دادہ گیر
خلق اگر روس دگر روم گیر   ہر چہ بجز حق ہمہ معدوم گیر
ساقی ہمّت کہ صَلا میدہد   بادہ ز خمخانۂ لا میدہد
ہمت اگر بال کشائے کند   صعوہ تواند کہ ہمائے کند
نیّرِ توفیق اگر بر دمد   لالہ عجب نیست کز اخگر دمد

مثنوی موسوم بباد مخالف(۵)

اے تماشائیانِ بزمِ سُخن   وے مسیحا دمان نادرہ فن
اے گرانمایگان عالمِ حرف   خوش نشینان این بساطِ شگرف
اے سخن پرورانِ کلکتہ   وے زبان آورانِ کلکتہ
اے رئیسان این سوادِ عظیم   وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ این شہر   بہر کارے رسیدۂ این شہر
اسدالله بخت برگشتہ   در خم و پیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمان شماست   بے سخن ریزہ چینِ خوان شماست
بہ تظلّم رسیدہ است اینجا   بامید آرمیدہ است اینجا
آرمیدن دہید روزی چار   خستۂ را بسایۂ دیوار
چون شنیدم کہ نکتہ پردازان   قدر دانان و انجمن سازان

از من آزردہ اندازان پاسخ
بہ نیایش بخاک سودم رُخ
نفسِ من بجمع درنگرفت
کس نیازم بہیچ برنگرفت
خاک پائے سخنورانستم
دوستاں راز کہترانستم
با بزرگان نیاز ہا دارم
ہم بدین شیوہ ناز ہا دارم
بندہ ام بندہ مہرناں را
رمز فہمان و نکتہ دانان را
نہ ز آویزشش بیان ترسم
من و ایمان من کزان ترسم
کہ پس از من بسالہائے دراز
بزبان ماند این حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود اینجا
چند روز آرمیدہ بود اینجا
با بزرگان ستیزہ پیش گرفت
زحمتی داد و راہ خویش گرفت
شوخ چشمے وزشت خوئی بود
بیحیائے و ہرزہ گوئی بود
آہ ازان دم کہ بعد رفتنِ من
خون دہلی بود بگردنِ من
تا بُوَم رنج دوستان باشم
بر دلِ انجمن گران باشم
شاد گردند کز میان بروم
آوخ از من کہ من چنان بروم
تاب ہنگامہ ام خدارا نیست
مہربانان دلست خارا نیست
زلّہ بردار کس چرا باشم
من ہُمایم مگس چرا باشم
فیضے از صحبتِ قتیلم نیست
رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنان کہ پارسے دانند
ہم برین عہد و رائے و پیمانند

کہ ز اہل زبان بنود قتیل   ہرگز از اصفہان بنود قتیل
لا جرم اعتماد را نسزد   گفتہ اش استناد را نسزد
کین زبان خاص اہلِ ایرانست   مشکل ما و سہل ایشانست
اے تماشائیانِ ژرف نگاہ   ہان بگوئید حسبۃً للہ
کہ چسان از حزیں بہ پیچم سر   آن بجا دو دمے بدہر سمر
دل دہد کز اسیر برگردم   زان نو آئین صفیر برگردم
دامن از کف کنم چگونہ رہا   طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ رُوح و روانِ معنی را   آن ظہوری جہان معنی را
طرز اندیشہ آفریدۂ اُوست   در تن لفظ جان دمیدۂ اُوست
فتنۂ گفتگوئے اینانم   مست لای سبوے اینانم
آنکہ طے کردہ این مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را
لیک باآن ہمہ کہ این دارم ،   گنجِ معنی در آستین دارم
دِل و جانم فدائے احباب ست   شوق وقف رضائے احباب ست
از من نارسائی ہیچمدان   معذرت نامہ ایست زی یاران
بُو کہ آید ز عُذر خواہیِ ما   رحم بر ما و بیگناہے ما

آشتی نامۂ وِداد پیام
ختم شد وَ السّلام وَ الاکرام

بیانِ نموداریِ شان نبوت و ولایت

مثنوی ششم

بعد حمد ایزد و نعتِ رسولؐ   می نگارم نکته چند از اصول
تا سوادش بخشد اندر رسم و راه   دیده ور را سرمه اعمیٰ رانگاه
نیستی عارف که گویم خود مباش   بد مبین و بد مگوی و بَد مباش
بد شمردی رَهروانِ پیش را   رهرو چالاک گفتی خویش را
گر سفر اینست منزل گه کجاست   لا اله گفتی الا الله کجاست
هست رسم خاص در هر مرز و بوم   خود چه میخواهی ز نفی این رسوم
نفیِ رسم کفر ما هم مے کنیم   داد با دانش فراهم مے کنیم
نفیِ کفر آئینِ اربابِ صفاست   نفی فیض اے تیره دل رسم کجاست
نفی رسم و ره هوا را مے کشد   نفی فیض ست اینکه ما را مے کشد
اے گرفتار خم و پیچ خیال   نفی بے اثبات نبود جز ضلال
وین که میگوئی توانا کردگار   چون محمدؐ دیگرے آرد بکار
نغز گفتی نغز تر باید شنفت   آنکه پنداری که هست اندر نهفت
گرچه فخر دودهٔ آدم بوُد   هم بقدر خاتمیّت کم بوُد
صورتِ آرائش عالم نگر   یک مه و یک مهر و یک خاتم نگر

یک جہان تا ہست یک خاتم بس است　　قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے　　ہم بُوَد ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃٌ للعالمینے ہم بُوَد
کثرتِ ابداعِ عالم خوبتر؟　　یا بیک عالم دو خاتم خوبتر؟
در یکے عالم دو تا خاتم مجوی　　صد ہزاران عالم و خاتم بگوی
غالبؔ ایں اندیشہ نپذیرم ہمی　　خُردہ ہم بر خویش می گیرم ہمی
ہر کرا با سایہ نپسندد خدا　　ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا
منفرد اندر کمالِ ذاتیست　　لاجرم مثلش محالِ ذاتیست

تقریظ "آئین اکبری" (۱۰)

مژدہ یاران را کہ این دیرین کتاب　　یافت از اقبالِ سیّد فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوے　　کہنگے پوشید تشریفِ نوے
وینکہ در تصحیحِ "آئین" رائی اوست　　ننگ و عارِ ہمت والائی اوست
بر چنین کاری کہ اصلش این بود　　آن ستاید کش ریا آئین بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم　　در وفا اندازہ دانِ خود منم
گر بدین کارش نگویم آفرین　　جائی آن دارد کہ جویم آفرین
گر ز آئین میرود با ما سخن　　چشم بکشا و اندرین دیرِ کہن

صاحبانِ انگلستان را نگر
شیوۂ و انداز اینان را نگر
زین ہُنر مندان ہُنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیان پیشی گرفت
حقِ این قوم ست آئین داشتن
کس نیارد مُلک بہ زین داشتن
آتشی کز سنگ بیرون آورند
این ہُنر مندان ز خس چون آورند
تا چہ افسون خواندہ اند اینان بر آب
دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخان کشتی بہ جیحون می برد
گہ دخان گردون بہامون می برد
نغمہ ہاے زخمہ از ساز آورند
حرف چُون طائر بپرواز آورند
ہین نمی بینی کہ این دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد گروہ
رُو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ در شب بیچراغ
کاروبار مردم ہشیار بین
در ہر آئین صد نو آئین کار بین
پیش این آئین کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
چون چنین گنج گہر بیند کسے
خوشہ زان خرمن چرا چیند کسے
ہر خوشی را خوشتری ہم بودہ است
گر سَری ہست افسری ہم بودہ است
مبداءِ فیاض را مشمر بخیل
نور میریزد رطب بازان نخیل
مُردہ پَرور دِن مبارک کار نیست
خود بگو کان نیز جُز گفتار نیست

غالب آئین خموشی دِلکشست
گرچہ خوش گفتی نگفتن ہم خوشست

مثنوی اَبرِ گہربار(۱)

سپاسے کزو نامہ نامی شود　　سخن در گزارش گرامی شود
سپاسے کہ آغاز گفتار زوست　　سخن چون خط از رُخ نمودار زوست
سپاسے کہ تا لب ازو کام یافت　　روانہا بدان رامش آرام یافت
خدا را سزد کز درون پَروری　　بدین شیوہ بخشد شناساوری
خدائی کہ زانگونہ روزی دہد　　کہ ہم روزی و ہم دو روزی دہد
خرَد جنسِ ہستی فروشندگان　　دہد مزد بیہودہ کوشندگان
رُباید دِل اما ز دِلدادگان　　کشد ناز لیکن ز افتادگان
جہان داور دانش آموزگار　　بہ خور روشنائی دہِ روزگار
بہر لب کہ جوئی نوائی ازوست　　بہر سر کہ بینی ہوائی ازوست
اگر دیوساریست بیہوش و ہنگ　　کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بُت سجدہ زان رو روا داشتہ　　کہ بُت را خداوند پنداشتہ
وگر خیرہ چشمیست نیّر پرست　　بُدرِ دمَی از جام اندیشہ مست

بمہرش از آن راہ جنبیدہ مہر
کزین روزنش دوست بنمودہ چہر
گروہی سراسیمہ در دشت و کوی
خداوند جوی و خداوند گوی
ز رسمی کہ خود را بر آن بستہ اند
بہ یزدان پرستی میان بستہ اند
نظرگاہِ جمع پریشان یکیست
پرستندہ انبوہ و یزدان یکیست
جہان چیست آئینۂ آگہی
فضائی نظرگاہِ وَجہُ اللّٰہی
ز ہر ذرّہ کارے بہ تنہائیش
نشاں بازیابی ز یکتائیش

مُنَاجَات

خدایا زبانی کہ بخشیدہٗ
بہ نیروئی جانی کہ بخشیدہٗ
دمادم بجنبش گر آید ہمے
ز راز تو حرفے سراید ہمی
ندانم کہ پیوندِ حرف از کجاست
درین پردہ لحنی شگرف از کجاست
گر از دِل شناسم جنون بیش نیست
کہ آن نیز یک قطرہ خون بیش نیست
خرد را سگالم کہ نیرو دہد
خود او راز من خیرگی رو دہد
ز ہر پردہ رنگے کہ گیرد کشادُ
چنان دلکش افتد کہ بی آن مباد
بہ یزدانیان فرّہٗ ایزدی
بیونانیان بہرہٗ بخردی
بساقی خرامی کہ از دلبرے
ز شاہد برَد دل بساقی گری
بشاہد ادائی کہ از سرخوشے
بساقی دہد داروئے بیہشے

ہر آئینہ مارا کہ تر دامنیم   ز دیوانگی با خرد دشمنیم
ز آلودگیہا اگر انے بُوَد   ہمہ سختی و سخت جانے بُوَد
اگر خوار وَر نارو ائیم ما   بباغ تو برگ گیائیم ما

بروزی کہ مردم شوند انجمن   شود تازہ پیوند جاں ہا بہ تن
بہ بخشائے برناکیہائے من   تہیدست و درماندہ ام وائے من
بدوشش ترازو منہ بارِ من   نسنجیدہ بگزار کردار من
بکردار سنجے میفزائے رنج   گرانبارئے درد عمرم بسنج
اگر دیگراں را بود گفت و کرد   مرا مایۂ عمر رنجست و درد
چہ پُرسی چو آں رنج و درد از تو بود   غمی تازہ در ہر نوَرد از تو بود
فرو ہل کہ حسرت خمیر منست   دم سرد من زمہریر منست
وگر ہمچنیں ست فرجام کار   کہ می باید از کردہ راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار دہ   چو گویم برآں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجوی   بود بندۂ خستہ گستاخ گوی
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سُود   چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سُود
ہمانا تو دانی کہ کافر نیَم   پرستارِ خورشید و آذر نیَم
نکشتم کسے را براہر یمنے   نبُردم ز کس مایہ در رہزنے

مگر مَی کہ آتش بگورم از دست
بہنگامہ پروازِ مورم از دست
من اندوہگین و مَی اندُہ ربای
چہ میکردم اے بندہ پرور خدای
حسابِ مَی و رامش و رنگ و بوے
ز جمشید و بہرام و پرویز جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مَی گاہ گاہ
بدریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائی نہ میخانۂ
نہ دستاں سرائی نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائی رامشگراں در رباط
شبانگہ بہ مَی رہنمونم شدی
سحرگہ طلبگار خونم شدی
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش
تقاضائے بیہودۂ میفروش
چہ گویم چو ہنگام گفتن گزشت
ز عمرِ گران مایہ بر من گزشت
بسا روزگاران بدلدادگے
بسا نوبہاراں بہ بی بادگے
بسا روز باراں و شبہائی ماہ
کہ بودست بی مَی بچشم سیاہ
افقہا پُر از ابر بہمن مہے
سفالینہ جام من از مَی تہے
جہان از گل و لالہ پر بوی و رنگ
من و حجرہ و دامنی زیرِ سنگ
دمِ عیش جُز رقصِ بسمل نبود
باندازۂ خواہشِ دل نبود
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست
وگر یافتم بادہ ساغر شکست
بنا سازگاری ز ہمسایگان
بسرمایہ جوئی ز بیمایگان

سر از منّت ناکسان زیر خاک
لب از خاکبوس خسان چاک چاک
بگیتی دَرَم بلینوا داشتے
دلم را اسیرِ هوا داشتے
نہ بخشندہ شاہی کہ بارم دہد
بہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چون پیل زانجا برانگیز می
زرش بر گدایان فرو ریز می
نہ نازک نگاری کہ نازش کشم
بہر بوسہ زلف درازش کشم
چو زان غمزہ نیشی بدل برخورد
رگِ جاں غمِ نوک نشتر خورد
بدان عمر ناخوش کہ من داشتم
زجان خار در پیرہن داشتم
چو دِل زین ہَوَسہا بجوش آیدی
ز دل بانگ خونم بگوش آیدی
ہنوزم ہمان دل بجوش اندرست
ز دل بانگ خونم بگوش اندرست
چو آن نامرادے بنیاد آیدم
بفردوس ہم دِل نیاسایدم
دلی را کہ کمتر شکیبد بباغ
در آتش چہ سوزی بسوزیدہ داغ
صبوحی خورم گر شرابِ طہور
کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرو یہائی مستانہ کو
بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بیخروش
چہ گنجائیِ شورش نای و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجُا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حُور در دل خیالش کہ چہ
غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منّت نہد ناشناسا نگار
چہ لذّت دہد وصل بے انتظار

گریزد دم بوسہ اینش کجا
فریبد بسوگند دینش کجا
بَرَد حکم و بنود لبش تلخ گوئی
دہد کام و بنود دلش کام جوئی
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزومند دلالۂ
نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگی رابکاو و ز دل
دو صَد دجلہ خونم تراود ز دل
بہَر جرم کز روئی دفتر رسد
ز من حسرتے در برابر رسد
بفرمائی کاین داوری چون بود
کہ از جُرم من حسرت افزون بود
بہ بندِ امید استواری فرست
بہ غالبؔ خط رستگاری فرست

نعت

درودی بعنوان دفتر نویس
بدیباچہ نعتِ پیمبر نویس
مُحَمَّد کز آئینۂ روئے دوست
جز ینش ندانست داناکہ اُوست
زہی روشن آئینۂ ایزدے
کہ درروی نگنجیدہ زنگ خودے
ز رازِ نہان پردۂ برزدہ
ز ذاتِ خدا معجزے سر زدہ
خہی قبلۂ آدمے زادگان
نظرگاہِ پیشین فرستادگان
بلندے دہِ کعب بالائے او
گرامے کُنِ سجدہ سیمائے او

مَنقبت

ہزار آفرین بر من و دین مَن   کہ منعم پرستیت آئینِ مَن
نبی را پزیرم بہ پیمانِ اُو   خدا را پرستم بہ ایمانِ اُو
خدایش رَوا نیست ہر چند گُفت   علیؑ را توانم خداوند گفت
پس از شاہ کس غیر دستور نیست   خداوند من از خدا دُور نیست
نبیؐ را اگر سَایہ صُورت نداشت   تردُّد ندارد ضرورت نداشت
دو بیجہ دو جا در نمود آمدہ   اثر ہا بیک جا فرود آمدہ
دو فرخندہ یار گرانمایہ بین   دو قالب زیک نور و یک سایہ بین
علی راست بعد از نبیؐ جاے اُو   ہمان حکم کُل دارد اجزاے اُو
ہمانا پس از خاتم المرسلینؐ   بُود تا بہ مہدی علی جانشین
مرا نا سزا گفتن آئین مباد   لب من رگِ ساز نفرین مباد
بود گرچہ با ہر کسم سینہ صاف   من و ایزد البتہ نبود گزاف
کہ تا کینہ از مہر بشناختم   بکس غیر حیدر نپَرداختم
جوانی برین دَر بسر کردہ ام   شبی در خیالش سحر کردہ ام

بود گرچہ ثابت کہ چون جان دہم   علی گویم و جان بیزدان دہم
بہ ہند و عراق و بہ گلزار و دشت   بسوی علی باشدم بازگشت

مغنّی نامۂ

مغنی دگر زخمہ بر تار زن گُل از نغمۂ تر بدستار زن
بہ پروازش آن گُل افشاں نوا نگویم غم از دل دل از من رُبا
دل از خویش بردار و بر ساز نہ ہم از خویش گوشی بر آواز نہ
ز گنجینۂ ساز بردار بند درین پردہ نقشے بہنجار بند
سخن گرچہ گنجینۂ گوہرست خرد را ولی تابشی دیگرست
ہمانا بشبہاے چوں پرِّ زاغ نہ بینی گہر جُز بروشن چراغ
بہ پیرایشِ این کہن کارگاہ بدانش توان داشت آئین نگاہ
بود بستگی را کشاد از خرد سرِ مرد خالے مباد از خرد
خرد چشمۂ زندگانے بود خرد را بہ پیری جوانے بُوَد
فروغِ سحرگاہ رُوحانیان چراغِ شبستانِ یونانیان
نخستین نمودار ہستی گراے خرد بود کامد سیاہی زداے
ز ہر ذرّہ کان آفتابے شود نگہ سرخوشِ کامیابی شود
خرد جویم ار خود بود مرگِ من بہ ہستی خرد بس بُوَد برگ من
سخن گرچہ پیغام راز آورد سرود ارچہ در اہتزاز آورد
خرد داند این گوہرین در گشاد ز مغزِ سخن گنج گوہر کشاد

خرد داند آن پرده بر ساز بَست   برامش طلسمے ز آواز بست
بدانش توان پاسِ دَم داشتن   شمارِ خرامِ قلم داشتن
ازین باده هر کس که سَرمست تر   بافشاندن گنج تر دست تر
بمستی خرد رہنمائے خودست   رَود گر ز خود هم بجائے خودست
زہے کیمیائے معانی سخن   بخود زندهٔ جاودانی سخن
سخن باده اندیشه مینائے اُو   زبان بے سخن لائے پالائے اُو
به پیمودن باده پیمانه گوش   خرد ساقی و خود خرد جرعه نوش
ز گنجی که بینش بویرانه ریخت   در آفاق طرحِ پریخانه ریخت
زدودن ز آئینه زنگار برد   زدانش نگه ذوقِ دیدار برد
خرد کرده عُنوانِ بینش درست   رقم سنجۂ آفرینش درست
فروغِ خرد فرّهٔ ایزدیست   خدا ناشناسی ز نا بخردیست
نظر آشنا روئی دانائیش   عمل رو شناسِ توانائیش
ز اندیشه دم زد نظر نام یافت   بکردار رفت از اثر کام یافت
بچشمِ سبکسیر از و گوش تاب   گرانپائے خواهش از و در حساب
غضب را نشاطِ شجاعت دہد   زخواهش به عفّت قناعت دہد
باندازه زور آزمائی کُنند   خورد باده و پارسائی کُنند
بدین جنبش از مرگ بخشد نجات   براندیشه پیماید آبِ حیات

ملشہاے شایستہ عادت شود   نظر کیمیائے سعادت شود
بدانش غم آموزگارِ منست   خزان عزیزان بہار منست
غمی کز ازل در سرشتِ منست   بود دوزخ امّا بہشتِ منست
بغم خوشدلم غمگسارم غمست   بہ بیدانشی پردہ دارم غمست
زمن جوئ در بد نکو زیستن   جگر خوردن و تازہ رو زیستن
درشتی بنرمی زبون داشتن   رسد گر ستم غمزہ پنداشتن
بعجز از درون سو جگر سوختن   بناز از برون سو رُخ افروختن
بدریوزہ گنجینہ اندوختن   ببازیچہ دانائی آموختن
شگفتن ز داغی کہ بر دل بود   نہفتن شرارے کہ در دِل بود
بدین جادہ کاندیشہ پیمودہ است   غم خضرِ راہ سخن بودہ است
نظامؔی کشد ناز تا بم کجا   زلاؔلی بود خفتہ خوابم کجا
نظامؔی بحرف از سروش آمدہ   زلاؔلی از و در خروش آمدہ
من از خویشتن با دلِ دردمند   نوائے غزل برکشیدہ بلند
نباشم گر از گنجہ گنجم بس ست   بغم گر چنیں پردہ سنجم بس ست
خود از درد بیتابِ خود چارہ جوی   خود آشفتہ مغز و خود افسانہ گوی
چراغی کہ بے روغن افروختم   دلے بود کز تابِ غم سوختم
نشاید کہ من شکوہ سنجم ز غم   خرو رنجد از من چو رنجم ز غم

غم دل ز من مرحبا جوئی باد   دِلم زار و لب مرحبا گوئی باد

سَاقی، نامۂ

بیَا ساقی آئینِ جم تازہ کُن   طَراز بساطِ کرم تازہ کُن
مبادا نظامی ز راہت برد   بدستان سُوئے خانقاہت برد
فریبش مخور چون مَی آشام نیست   ستمدیدۂ گردش جام نیست
ورع پیشہ مِسکین چہ داند ترا   بہ آرایش نامہ خواند ترا
رضاجوئے من شو کہ ساغر کشم   گرم نیل و جیحون دہی درکشم
اگر زود مستم پریشان نیَم   وگر دیر مستم گرانجان نیَم
ہمانا تو دانستۂ کز دو سَال   ننوشم مَی الاّ بہ بزم خیَال
زلب تشنگی چون. ہمَی درخورم   تو کمتر خور امروز تا برخورم
زخود رفتہ ترکیست ہندوی تو   عجب بنود از خوبی خوی تو
کہ جوئی رضائی زخود رفتۂ   دہی مَی بہ ترکِ جگر تفتۂ
ندانی پس از روزگاری دراز   ہمی کردہ ام دست باری دراز
در اندیشہ محوِ تلاشم ہنوز   قدح ساز و ساقی تراشم ہنوز
مَی خویش و جام سفالِ خودم   نہ ساقی کہ من ہم خیال خودم
مرا دستگاہِ مے و شیشہ کو   نشاطی چُنین جز در اندیشہ کو

مَی و شیشه بگزار و بگزر ز من   همانا نه من بلکه این انجمن
نه از من ز سعدیؔ شنو تا چه گفت   سخن گفت در پرده اما چه گفت
رہِ عقل جُز پیچ در پیچ نیست   برِ عارفان جُز خدا ہیچ نیست
دگر رہروی گوید از زیر دَلق   که حقیّت محسوس و معقول خلق
خیالی در اندیشه دارد نمود   همان غیب غیبست بزمِ شهُود
نشانهائے رازِ خیالِ خودیم   نواهاے سازِ خیالِ خودیم
تصوّف نزیبد سُخن پیشه را   سخن پیشه رند کژ اندیشه را
نشان مند این روشنائی نه   غزل خوان و مَیخور سنائی نه
غزل گر نباشد نوائے دِگر   سَرِ دل سلامت هوائے دِگر
غزل گر ملال آرد افسانه گوی   کہن داستانهائی شاهانه گوی
من آن خواهم اے لاابالی خرام   کزین پویه خوشتر سگالی خرام
ز شاهان سُخن گر گہر سُفتنست   سخن گفتن از حق جگر سفتنست
ننالی ز غم گر جگر سفته شد   سخنهاے حق بین که چون گفته شد
ننالم ز پیری جوانم برائے   هنوزم بود طبع زور آزمائے
سخن سَنج معنے ترازم هنوز   بشیوائیِ شیوه نازم هنوز
ز فردوسیم نکته انگیز تر   ز مُرغِ سحر خوان سحر خیز تر
بمستی توان نغز گفتار بود   مرا باید از خویش هشیار بود

قصیدہ اوّل[1] در توحید

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ　　گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پُر وا نگہی　　پردۂ رسمِ پرستش در میان انداختہ
اے اساسِ عالم و اعیان بہ پیوند الف　　ہمچنان بر صورتِ علم و عیان انداختہ
عاشقان در موقفِ دار و رسن وا داشتہ　　غازیان در معرضِ تیغ و سنان انداختہ
رنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ　　نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیان انداختہ
تا علاجِ خستگے آسائشِ دیگر دہد　　خارہا در رہ گزارِ میہمان انداختہ
اے عمل را دادہ فرجامِ مکافاتِ عمل　　گرچہ دانا شرحِ آنرا بر زبان انداختہ

قصیدہ دوم[2] در نعت

مرا دلیست بہ لپس کوچۂ گرفتاری　　کشادہ روئے تر از شاہدانِ بازاری
ز طوطیانِ شکر خا مگوی و از من جوی　　نشاطِ زمزمہ و لذّتِ جگر خواری

قصیدہ سوم(۳) در نعت

آن بلبلم کہ در چمنستان بشاخسار   بود آشیان من شکنِ طرّۂ بہار
ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرود و سور   پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مَیٔ و قمار
باکیسہ در خصومت و باکاسہ در لجاج   رندان پاکباز و شگرفان شادخوار
بد مستیٔ شبینہ و خواب سحرگہے   رنگینیٔ سفینہ و اشعار آبدار
چشم کشودہ اند بجر دارہائے من   زایندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار

قصیدہ ششم(۶) در منقبت

نظارۂ خوبان و مَی و نغمہ حرامست   دیدیم و شنیدیم سَمِعنَا و اَطَعنَا
با ایں ہمہ ہر جا کند آہنگ خرابے   سرگرمیٔ شوقی کہ بود حوصلہ فرسا
با نغمۂ مطرب نتواں شد متعصّب   از جلوۂ ساقی نتواں کرد تبرّا
شوقست کہ چون نشاۂ توحید رساند   از دار بَرَد پایۂ منصور ببالا
شوقست کہ فرہاد ازو مردہ بہ سختی   شوقست کہ مجنون شد ازو بادیہ پیما
شوقست کہ مرآت مرا دادہ بہ صیقل   شوقست کزو طوطیِ طبعم شدہ گویا
شوقست کز اعجاز اثرہائے قبولش   آئینۂ پیدائی حرف ست ورقہا
قانع بہ سخن نیستم و باک ندارم   زخویش سپاس ست و نہ از غیر محابا

نظارگیٔ جلوهٔ اسرار خیالم   در آئینهٔ چشم حسود و دلِ اعدا
زاویزشِ دونان ز سخن باز نمانم   سیلاب مرا زین خس و خاشاک چه پروا
شوقم همه راز ست من و عربده هرگز   سوزم همه ساز ست من و شکوه مبادا

قصیده یازدهم (۱۱) در منقبت حضرت عباسؑ ابن علیؑ

آوارهٔ غربت نتواں دید صنم را   خواهم که دگر بتکده سازند حرم را
آزاده روی در نظرم خوار و زبوں کرد   توقیع جهاں بخشیٔ شاهان عجم را
همت نکشد ننگ نکو نامیٔ احسان   برخیز و ببازیچه فرو ریز دِرَم را
رو همّت از آن تشنه جگر جوئی که از مهر   بر تشنگیٔ شاه فدا ساخته دم را

قصیده دوازدهم (۱۲) در منقبت امام دوازدهم (۱۲)

هست از تمیز گر به هما استخواں دهد   آئین دهر نیست که کس را زیاں دهد
مرد ست مرد هر چه کند بے خطر کند   راد ست راد هر چه دهد رائیگاں دهد
گلزار را اگر نه ثمر گل بهم نهد   درویش را اگر نه سحر شام ناں دهد
گنجِ سخن نهد به نهاں خانهٔ ضمیر   وانگه کلید گنج بدستِ زباں دهد
تا روز خاک تیره نگردد ز رشک چرخ   رخشانیٔ ستاره بریگ رواں دهد
تا آدمے ملال نگیرد ز یک هوا   سرماؤ نو بهار و تموز و خزاں دهد

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن   تا راحت مشام و نشاط روان دہد
ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق   تا آرزوے کام و مراد رہان دہد
نظارۂ متاع اثر بر دکاں نہد   اندیشہ را شمار گہر در نہان دہد
آنرا کہ بخت دسترس بذل مال نیست   طبع سخن رس و خرد خردہ داں دہد
آنرا کہ طالع کف گنجینہ پاش نیست   نعم البدل ز خامۂ پرویں فشاں دہد

قصیدہ سیزدہم (۱۳) در مدح اکبر شاہ و شاہزادہ سلیم

حکایتیست اگر بشنوے فرو گویم   بشوخیے کہ چکد خون ز جبہۂ تسلیم
اگر ز اکبر شہ بود بہرور عرفی   دگر ز شاہجہاں بود مایہ دار کلیم
نہ کمترم ز حریفان بہ فن شعر و سخن   نہ کمتری ز نیاگان بجود و خلقِ عمیم
بہ دیدہ داد مرا و ترا نبودہ نظیر   بہ ترک و برگ مرا و ترا نبودہ سہیم
چہ نیک رائے ارسطو چہ شاہ اسکندر   چہ بیدپاے برہمن چہ رائے دابشلیم
شہود ہمت تست آنکہ در مشیمۂ غیب   دہد بہ قطرۂ آبی نمود دُرِّ یتیم
صریر کلکِ منست آنکہ در نشیمن قدس   بہ زہرہ شیوۂ رامشگری کند تعلیم
ز گرمیٔ نفس خویش میتوانم داد   برائے سکۂ نامت گدازش زر و سیم
بہ آستین گہر ریز میتوانے کرد   فراز بام امیدم ظہور صبح و نسیم
مرا بشیوۂ جادو دمی ہمال محال   ترا بپایۂ شاہنشہے عدیل عدیم

روا مدار کہ ہم در وطن دودل باشم   چو خستہ رہروی در کارواں سرائے مقیم
چہار چیز بود آنکہ جاوداں باشد   بحکم آں کہ ز اسمائے اوست حیٔ قدیم
عطیّہ بخشیِ مہر و عطا پزیریِ ماہ   بقائے پادشہ و عیش شاہزادہ سلیم

قصیدۂ پانزدہم (۱۵) در مدح بہادر شاہ ظفرؔ

زہے ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ   سراج دین نبی بوظفر بہادر شاہ
محیط بخشش و دریا کف و سحاب نوال   قمر لوائے و فلک خرگہ و ستارہ سپاہ
رئیسِ تاجوراں خسرو جہاں داور   دلیل راہ رواں مرشدِ خدا آگاہ
زحق عطیّہ پزیرد چو ماہتاب ز مہر   بہ خلق بہرہ رساند چو آفتاب بماہ
چو او نکردہ کس از اہل دیں بفرش حصیر   نشاط شاہی و فرماندہی خداست گواہ
چو او نگفت کس از خسرواں برفے سریر   حدیث فقر و فنا لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ
بیارگہ زُسم خانہ سپہر خراب   ندیم شہ نشوم روئے روزگار سیاہ
چہ دل نہم بہ گہرپاشیٔ سخن چو مرا   ہزار آبلہ بر دل بُوَد ز گرمیٔ آہ
چہ سر کنم روشِ مدح گستری چو مرا   بزمِ خسروِ گیتی ستاں نباشد راہ
زکار رفتہ دل و دست من چناں کہ مرا   نماندہ شادیٔ پاداش و رنج بادا فراہ
نہ از تو لطف و نہ از حق مدد زہے حرماں   نہ تاب شکوہ نہ جائے سخن معاذاللہ
نباشدم صلہ مقصود مدح خوانِ توام   بدیں ذریعہ مگر یادم آوری گہہ گاہ

وگر عطیہ فرستی شگفت ہم نبوَد — کہ می رسد ز نمِ ابر تازگے بہ گیاہ
بچشمِ کم منگر گرچہ خاکِ راہِ توام — کہ آبروئے دیارم دریں خلافت گاہ
باخذِ فیض ز مبداء، فزونم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیر تر بداں درگاہ
نزولِ من بجہان بعد یکہزار و دویست[۱۲] — ظہورِ سعدی و خسرو بششصد و پنجاہ[۶۵۰]
کنوں تو شاہی و من مدح گو تعال تعال — گذشت دورِ نظیری و عہدِ اکبر شاہ
بہ فنِّ شعر چہ نسبت بہ من نظیری را — نظیرِ خود بسخن ہم منم سخن کوتاہ
سخن سرائیِ غالب سپس برسم دعاست — اجابت از حق و خواہش ز بندۂ درگاہ

قصیدہ شانزدہم (۱۶) در مدح بہادر شاہ ظفر

ردیف شعر ازاں کردم اختیار گرہ — کہ از منست بر ابروئے شہریار گرہ
گرہ کشاے رموزِ خرد بہادر شاہ — کہ پیشِ ناخنِ تدبیر اوست خوار گرہ
بدلکشائیِ گفتارِ من کہ غالب را — مزن برشتۂ امید زینہار گرہ
ازیں گرہ کہ بر ابرو زدی چرا ترسم؟ — کہ در دولت ز صفا نیست پائدار گرہ

قصیدہ ہفدہم (۱۷) در مدح بہادر شاہ ظفر

گفتم حدیثِ دوست بقرآں برابرست — نازم بہ کفرِ خود کہ بایماں برابرست
بیدست گر نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل — شوریست در سرم کہ بساماں برابرست

نے وعدۂ نہ پرسش رائے، نہ شکوۂ   داغم زنامۂ کہ بہ عنواں برابرست
نے کف گرفتہ ساعد و نے لب ربودہ بوس   درناخوشی وصال بہ ہجراں برابرست
ترک وجود گیر سخن در سجود چیست   بگذر زطاعتی کہ بعصیاں برابرست
در دیدۂ جریدہ روانِ یگانہ بیں   کثرت بخوابہائے پریشاں برابرست

قصیدہ نوزدہم (۱۹) در مدح بہادر شاہ ظفر

دوش در عالم معنی کہ زصورت بالاست   عقل فعّال سراپردہ زد و بزم آراست
رفتم آشفتہ و سرمست و پس از لابہ و لاغ   گفتم اینک دل و دیں گفت خوشت باد کجاست
گفتم اسرار نہانی ز تو پرسش دارم   گفت جز محرمیٔ ذات کز بیچون چراست
گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ راز   گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست
گفتم از کثرت و وحدت سخنی گوئی بہ رمز   گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست
گفتم آیا چہ بود کشمکش ردّ و قبول   گفت آہ از سرِ ایں رشتہ کہ در دست قضاست
گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال   گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست
گفتم آں خسرو خوباں بسخن گوش نہد   گفت گر گوش نہد زہرۂ گفتار کراست
گفتم از اہل فنا گر خبری ہست بگوی   گفت ایں قافلہ بے گرد رہ و بانگ دراست
گفتم افسوس کہ کمتر دہدم داد سپہر   گفت خاموش کہ در داد نگنجد کم و کاست
گفتم آں بیت کہ ہموارہ سرائی از کیست   گفت غالب کہ ہم از غالبِ آشفتہ نواست

گفتم از چیست کہ چوں شمع گدازد نَفَسَم
گفت اے جان پدر روشنیٔ طبع بلاست

قصیدہ بست و سوم (۲۳) در مدح بہادر شاہ ظفر

ما ہمانیم و سیہ مستیِ ہر روزہ ہمان
نہ شب جمعہ شناسیم نہ ماہ رمضان
مستیَم را نہ بود نامہ سیاہے فرجام
مستیَم را نبود بادہ پرستے عنوان
مستم اما نہ ازان بادہ کہ آید ز فرنگ
مستم اما نہ ازان بادہ کہ سازند مغان
للہ الشکر کہ در ساغر من ریختہ اند
مۓ بیرنگ ز میخانۂ بے نام و نشان
ہمدریں فصل کہ مستانہ سخن می گزرد
نکتۂ چند سرائیم ز وجوب و امکان
ہستیِ محض تغیر نہ پذیرد زنہار
حرف الآن کما کان ازیں صفحہ بخوان
ہمچنان در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودی کہ ندارند ز خارج اعیان
عالم از ذات جدا نبوَد و نبود جز ذات
ہمچو رازی کہ بود در دل فرزانہ نہان

قصیدہ بست و پنجم (۲۵) در مدح بہادر شاہ ظفر

در بہاران چمن از عیش نشانے دارد
برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانے دارد
باد را راہ بہ خلوت کدۂ غنچہ چراست
گر نہ با شاہد گل راز نہانے دارد
باد چوں نو سفران در دم رفتن رقصد
آب چوں نکتہ وران طبع روانے دارد
دہر گویند ندارد روشِ دانش و داد
ہمہ دارد کہ چو غالبؔ ہمہ دانے دارد

نطق تنہا نبود مشق سخن را کافی سخن اینست کہ ایں تیر کمانے دارد
ہمچو شاہد کہ تحاشی زند اندر آغوش خامہ در دست من از ناز فغانے دارد
درد با زمزمۂ مردہ دلاں بوالعجبیست موج خوں جوئے دراں تن گروانے دارد
بے خزاں باد بہار تو علی الرغم جہاں تا جہانست و بہاری و خزانے دارد

قصیدہ بست و ششم (۲۶) در مدح بہادر شاہ ظفر

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند پاے را پایہ فراتر ز ثریا بینند
ہر چہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند ہر در سینہ نہانست ز سیما بینند
راز زیں دیدہ وراں جوئے کہ از دیدہ ورے نقط گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی جادہ چوں نبض تپاں در تن صحرا بینند
شرری را کہ بناگاہ بدر خواہد جست زخمہ کردار تبار رگ خارا بینند
قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست صورت آبلۂ بر چہرۂ دریا بینند
قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند
برہم و زمزمہ و قشقہ و زنّار و صلیب خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلّا بینند
دل نہ بندند بہ نیرنگ دریں دیرِ دو رنگ ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند
ہر چہ در سو نتوان یافت بہر سو یابند ہر چہ در جا نتوان دید بہر جا بینند

قصیدہ بست وہفتم (۲۷) در مدح بہادر شاہ ظفر

بیا و بادہ بہنگامہ آشکارا خور   نماند راز نہانی کہ ترسی از غماز
بدست انچہ بہندوستاں کشند از قند   ہم از فرنگ بیار ار نباشد از شیراز
دعا بصورت شرط و جزا کہن رسم است   نہ بست دل بچنیں شیوہ خامۂ طنّاز
برای شاہ ز یزداں طلب کنم شش چیز   بہ صد ہزار تضرّع ز روئے عجز و نیاز
تنِ درست و دلِ شاد و طالعِ فرّخ   شکوہِ وافر و ملکِ وسیع و عمرِ دراز

قصیدہ بست ونہم (۲۹) در مدح ملکہ وکٹوریہ انگلستان

آں مور سر کشم کہ چو مرگش اماں دہد   از ننگ پائمال بہ پرواز جاں دہد
راہ سخن کشودم اگر خود نشد کہ بخت   راہم بہ بزم بانوے گیتی ستاں دہد
وکٹوریا کہ کاتب قسمت ز دفترش   توقیع خسروی بجہاں خسرواں دہد
آن خواہم از خدائے توانا کہ روزگار   از من پزیرد انچہ مرا بر زباں دہد
آن باد کایں شہنشہ فرخ تبار را   از شرق تا بغرب کراں تا کراں دہد
آن باد و در خورست کہ فرماندہی کنم   بر یک دو دہ کہ گنگ بہندوستاں دہد
آن باد و خوش بود کہ شہنشاہ بحر و بر   انجام خواہشِ اسد اللہ خاں دہد

قصیدہ سی ام (۳۰) در مدح شہنشاہ انگلستان

در روزگارہا نتواند شمار یافت
خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بدہر
ہر کس نشاط تازہ زہر گونہ کار یافت
فیضِ سحر بہ غالبؔ پیمانہ کش رسید
ذوقِ صبوحِ عابدِ شب زندہ دار یافت

قصیدہ سی و پنجم (۳۵) در مدح چارلس مٹکاف

یافت آئینۂ بخت تو ز دولت پرواز
ہلہ کلکتہ بدیں حسن خدا ساز بناز
گل برافشاں بگریبان چو حریف سرمست
جلوہ گر شو بنظرۂ ہمچو عروس طناز
وقت آنست کہ پائیز تو گردد نوروز
وقت آنست کز انجام تو بالد آغاز
سیرگاہیست در اطراف تو گوئی کشمیر
روستائیست ز اقصائے تو گوئی شیراز
چارلسؔ مٹکفِ فرخندہ شمائل کہ بدہر
بستہ برامن نظارہ ز فردوس طراز
ایں رقمہا کہ فرو ریختہ ام از رگِ کلک
باشد آرائشِ تقریب پئے عرضِ نیاز
پنج مطلب ز تو ام ہست و بصد گونہ امید
خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اوّل اینست کہ در بابِ معاشی کہ مراست
کنی اندیشۂ محکم بہ طریق ایجاز
دوم آں کز اثر عدل تو اے سنجر عہد
غیر با بندہ دریں وجہ نباشد انباز
سوم آنست کہ دیگر نکنم دستِ طلب
پیش فرماندہِ میوات بدریوزہ دراز

چارم آنست کہ باقی زرِ چندیں سالہ   بے نزاع و جدل و جہد بمن گردد باز
پنجم آن کز پسِ ایں فتح کہ بنماید روی   دہیَم مژدۂ اکرام و نویدِ اعزاز
بخشیَم تازہ خطابی و بران افزائے   خلعتی درخورِ ایں دولتِ جاوید طراز
بہ کہ کوتہ کنم افسانۂ دعوے بہ دُعا   زانکہ دانم سرِ این رشتہ درازست دراز

قصیدہ سی و ہفتم (۳۷) در مدح پرنسپ بہادر

بے مَی نکند در کفِ من خامہ روائے   سرِ دست ہوا آتشِ بے دود کجائے
در مدح سرائم غزل و باک ندارم   کز ذوق بود ایں ہمہ آشفتہ نوائے
اے آنکہ کند سایۂ دستِ تو ہمائے   مہلت کہ شاہی ز تو خواہم بگدائے

قصیدہ سی و ہشتم (۳۸) در مدح ٹامس ماڈک

ہر چہ در مَبداءِ فیاض بود آنِ منست   گل جدا ناشدہ از شاخ بدامانِ منست
مستیم عام مدان و روشم سہل مگیر   ناقۂ شوقم و جبریل حدی خوانِ منست
جادۂ عرفی و رفتارِ شفائی دارم   دہلی و آگرہ شیراز و صفاہانِ منست
شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب   اے تو غائب ز نظر مہرِ تو ایمانِ منست
لطفِ یزداں ز غمِ دہر نگہبانِ تو باد   اے کہ لطفت ز غمِ دہر نگہبانِ منست

قصیدہ چہل و دوم (۴۲) در تہنیت فتح پنجاب

رسیدہ است بگوشم صدائے فتح الباب   زترکتاز سپہ در قلمرو پنجاب
علو حوصلۂ ایں جہاں ستاناں بیں   کہ فتح را بصفا صلح کردہ اند حساب
کنون کہ ملک مطیعست و راہ بیخس و خار   زمن بگو بفروشندگان بادۂ ناب
شراب قندئ ہندوستان دماغم سوخت   زشیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

قصیدہ چہل نہم (۴۹) در مدح فرزوائے اودھ

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم   ہوس زلف ترا سلسلہ جنبان رفتم
نتواں منّتِ جاویدؔ گوارا کردن   ہمچناں تشنہ ز سرچشمۂ حیوان رفتم
حال من نبگر و از عاقبت کار مپرس   عمر خود گشتم و در غصہ بپایان رفتم
ناروا بود ببازار جہاں جنس وفا   رونقے گشتم و از طالع دکان رفتم
نگہم نقب بگنجینۂ دلہا میزد   مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میدان رفتم
لکھنؤ دام نشاطے سر راہم گسترد   بیخود از ولولۂ شوق پرافشان رفتم
نازپروردۂ خلوت گہ آزاد گیم   کافرم گر بسراپردۂ سلطان رفتم
من ہم از خیل گدایانم و خجلت نبوَد   گر بدریوزہ بدرگاہِ کریمان رفتم
مدحت نائب مہدی ز محبت باشد   شادمانم کہ بہ ہنجار محبّان رفتم

قصیدہ پنجاہم (۵۰) در مدح امجد علی شاہِ اودھ

با من کہ تاب ناز نکویاں نداشتم   بد کرد کہ جور و جفا کرد روزگار
گفتم بہ عقلِ کل کہ ندانم برائے من   حکم دوام حبس چرا کرد روزگار
گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نۂ   کازا گرفت و باز رہا کرد روزگار
تو بلبلے ہمیں کہ بدام آمدی ترا   اندر قفس زبہرِ نوا کرد روزگار

قصیدہ پنجاہ و ہفتم (۵۷) در مدح وزیر الدولہ والی ٹونک

عیدِ اضحےٰ بسرِ آغاز زمستاں آمد   وقت آراستنِ حجرۂ و ایواں آمد
چند چیز ست کہ در پیش گہ اہلِ تمیز   بہ گرانمائگی آرائشِ گیہاں آمد
آن درخشندہ درفشے کہ بیغمائے عرب   در زمان عمر از لشکر ایراں آمد
آن فروزندہ و فیروز و دل افروز نگیں   کہ روائی دہِ فرمان سلیماں آمد
دیگر آں جام جہاں بیں کہ بروشن روشی   عالم افروز تر از مہرِ درخشاں آمد
دیگر آں تخت سبکسیر کہ از تیز روی   ہمدم باد چو بوئی گل ریحاں آمد
ہفت گنجینۂ پرویز کہ در ہفت اقلیم   بہ نموداری ہفت اختر تاباں آمد
فہم ہر نکتۂ غامض کہ پیمبر فرمود   فیض ہر آیت رحمت کہ بقرآں آمد
یارب اینہا بتو بخشند و برآں افزاید   دم آبی کہ ز سر چشمۂ حیواں آمد

قصیدہ پنجاہ و ہشتم (۵۸) در مدح والی الور

چون من گہر فروش نباشد بہر بساط   چوں من سخن سرائے نخیزد ز ہر دیار
پیرم ولے بہ طبع جوانان گران نیمَ   غم خوردنم نہفتہ و مَی خوردن آشکار
زاں پس کہ گشت گوہر من در جہاں یتیم   زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بکارزار
در پنجسالگی شدہ ام چاکرِ حضور   رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
دارم بگوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال   اکنون کہ عمر شصت و سہ سالست در شمار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست   در خاک راج گڑھ پدرم را بوَد مزار
فرزانہ داورا و کرم پیشہ سرورا   دارم دلے ز زخم جفاے فلک فگار
با ایں ہمہ سموم غموم خرد گداز   سہلست غم کہ والی ملکی و غمگسار
پاداش جانگدازی من در طریق نظم   دستی بدستگیرئ من ز آستیں برآر

قصیدہ شستم (۶۰) در مدح مصطفٰے خاں شیفتہ

زخمہ برتارِ رگ جاں میزنم   کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم
رازدانِ خوئ دہرم کردہ اند   خندہ بر دانا و ناداں میزنم
در خراباتم ندیدستی خراب   بادہ پنداری کہ پنہاں میزنم
خوے آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم ز عصیاں میزنم

می ستیزم با قضا از دیر باز   خویش را بر تیغ عریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر مے کنم   بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم
آں ہمائے تیز پروازم کہ بال   در ہوائے مصطفےٰ خاں میزنم
خوبیٔ خویش بدآموز من ست   دم زیاری میزنم ہاں میزنم
بنگرد بے آنکہ کلک آں را کشد   نقش گر بر صفحۂ جاں میزنم

قصیدہ شصت و یکم (۶۱) در مدح مفتی صدرالدین آزردہ

زاں می ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من   وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من
نامرادم داد ایں افزونیٔ خواہش بدہر   آب بر من بستہ اند آری ز استقائے من
دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید   آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من
صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار   میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائے من
خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود   سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

قصیدہ شصت و دوم (۶۲) در مدح برادر نسبتی ضیاالدین نیّر

منم خزینۂ راز و در خزینۂ راز   ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بدین و دانش و دولت یگانۂ آفاق   بعمر کہتر و از روے رتبہ مہتر من
بنکتہ شیوۂ شاگرد من بمن ماناست   صنم بصورت خود می تراشد آذر من

قصیدہ شست و سوم (۶۳) در مدح مختارالملک بہادر حیدرآباد

در مدح سخن چسان نگویم   شرطست کہ داستان نگویم
گفتے کہ بہ پیشگاہ نواب   بسیار نگوئے ہان نگویم
مختارالملک را درین عصر   جز آصف جم نشان نگویم
پاکیزگیٔ نہاد پاکش   جز در صفت قدسیان نگویم
نازم روش سخن سرائے   از گوہر خود نشان نگویم
والا گہرا سپہر جاہا   اینہا زرہ گمان نگویم
کس نیست متاع را خریدار   با آنکہ بہا گران نگویم
زان روکہ خردورانِ گیتی   رنجند چو قدر دان نگویم
ناچار متاع عرضہ دارم   بے رونقی دکان نگویم
تابِ سفر دکن ندارم   از ناقہ و ساربان نگویم

قصیدہ شست و چہارم (۶۴)

از نکوئی نشاں نمے خواہم   خویش را بدگماں نمے خواہم
آرزو عیب نیست خردہ مگیر   خواہم اما چناں نمے خواہم
رنج صاحبدلان روا نبود   بند اہلِ زباں نمے خواہم

دو شہا را نگار پسندم   بارہا را گراں نمے خواہم
مور را مار گیر نپذیرم   پشّہ را پیلباں نمے خواہم
بہر خویش از زمانۂ غدّار   راحت جاوداں نمے خواہم
آتش اندر نہاد من زدہ اند   لالہ و ارغواں نمے خواہم

گہر افشانم و بہا طلبم   سیم و زر رائیگاں نمے خواہم
با صلیبم فتادہ کار بدہر   عَلَمِ کاویاں نمے خواہم

در مدح گورنر لارڈ الگن از شش قصیدہ ہائی مجموعہ سبد چین

بیا کہ مدح خداوند دادگر گویم   زآنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم
زشاعری بہ ندیمی رسیدہ ام خواہم   کہ رویداد بہ پیرایۂ سمر گویم
رعایت ادب آئینِ من بَوَد ناچار   فسانہ گرچہ دراز ست مختصر گویم
سخن نہالِ نو و کہنہ باغباں غالبؔ   نہال را بہ نوی مژدۂ ثمر گویم
طریقِ وادیٔ غم راکسی نبودہ رفیق   خود از صعوبتِ ایں راہ پُر خطر گویم
در آں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست   دکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم
زعزّ و جاہ نیاگانِ خویش در سرکار   ہزار گونہ حکایاتِ معتبر گویم
دعائے دولت شاہ و وزیر ہموارہ
زنیم شب کنم آغاز و تا سحر گویم

غزلیات

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا
با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا
آب نہ بخشی بزور خونِ سکندر ہدر
جان نہ پزیری بہیچ نقد خضر ناروا
بزم ترا شمع و گل خستگئ بوتراب
سازِ ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

خاموشی ما گشت بدآموز بتان را
زیں پیش و گرنہ اثری بود فغاں را
بر طاعتیان فَرُّخ و بر عشرتیان سہل
نازم شبِ آدینۂ ماہ رمضاں را

عیش و غم در دل نمی اِستد خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما
ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ہمچون دود بالا میرود از بالِ ما
جان غالبؔ تابِ گفتاری گمانداری ہنوز
سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوالِ ما

گر بیائی مست ناگاہ از در گلزار ما
گل ز بالیدن رسد تا گوشۂ دستار ما
سخت جانیم و قماش خاطر ما نازکست
کارگاہِ شیشہ پندارے بُوَد کہسارِ ما

غالب از صہبائی اخلاق ظہوری سرخوشیم
پارۂ بیش است از گفتار ما کردار ما

ازیں بیگانگیہای تراود آشنائیہا
حیای ورزد و در پردہ رسوائی کند ما را
حذر از زمہریر سینۂ آسودگان غالب
چہ منتہا کہ بر دل نیست جان ناشکیبا را

محو کن نقش دوئی از ورق سینۂ ما
اے نگاہت الفِ صیقل آئینۂ ما
غالب امشب ہمہ از دیدہ چکیدن دارد
خون دل بود مگر بادۂ دوشینۂ ما

جوئی از بادہ و جوئی ز عسل دارد خلد
لب لعل تو ہم اینست و ہم آنست مرا
خارہا از اثر گرمیٔ رفتارم سوخت
منتے بر قدمم راہرو انست مرا
رہروِ تفتۂ در رفتہ بہ آبم غالب
توشۂ بر لبِ جو ماندہ نشانست مرا

آشنایانہ کشد خارِ رہت دامن ما
گوئی این بود ازیں پیش بہ پیراہن ما
بتو چون بادہ کہ در شیشہ ہم از شیشہ جداست
نبُد آمیزش جاں در تن ما با تن ما
سخن ما ز لطافت نپذیرد تحریر
نشود گرد نمایاں ز رَم توسنِ ما
طوطیان را نبود ہرزہ جگر گون منقار
خوردہ خون جگر از رشک سخن گفتن ما
ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فن ما

نقشی ز خود براہ گزر بستہ ایم ما   بر دوست راہ ذوقِ نظر بستہ ایم ما
با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نمے کنند   خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

در گرد غربت آئینہ دار خودیم ما   یعنی ز بیکسان دیار خودیم ما
دیگر ز ساز بیخودیٔ ما صدا مجوی   آوازی از گسستن تارِ خودیم ما
از بسکہ خاطر ہوس گل عزیز بود   خون گشتہ ایم و باغ و بہارِ خودیم ما
ہر کس خبر ز حوصلۂ خویش میدہد   بدمستی حریف و خمارِ خودیم ما
غالب چو شخص و عکس در آئینۂ خیال   با خویشتن یکے و دوچارِ خودیم ما

بہ شغل انتظار مہوشان در خلوت شبہا   سرِ تارِ نظر شد رشتۂ تسبیح کوکبہا
خوشا رندی و جوش زندہ رود و مشرب عذبش   بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہبہا

پس از عمری کہ فرسودم بمشق پارسائیہا   گدا گفت و بمن تن در نداد از خود نمائیہا
چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحثِ ناز پیچیدن   نگہ در نکتہ زائیہا نفس در سرمہ سائیہا
سخن کوتہ مرا ہم دل بتقویٰ مائلست اما   ز ننگِ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا
ز انجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب   بدار الملک معنی مے کنم فرمان روائیہا

من آن نیَم کہ دگر میتوان فریفت مرا فریبمَش کہ مگر میتوان فریفت مرا
شب فراق ندارد سحر ولے یکچند بہ گفتگوے سحر میتوان فریفت مرا
سرشت من بود این ورنہ آن نیَم غالبؔ کہ از دف بہ اثر میتوان فریفت مرا

زمن گرت نبود باور انتظار بیا بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا
ہلاکِ شیوۂ تمکین مخواہ مستان را عنان گسستہ تر از بادِ نوبہار بیا
زما گسستی و با دیگران گرو بستے بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
ز خوے تست نہادِ شکیب نازک تر بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا
حصار عافیتی گر ہوَس کنی غالبؔ چو ما بہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

چون بہ قاصد بسپَرم پیغام را رشک نگذارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیٔ روزم نہان کو چراغی تا بجویم شام را
آن میَم باید کہ چون ریزم بجام زورِ مَے در گردش آرد جام را
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود خوش بود گر دانہ نبود دام را
زحمت عام ست دائم خاص را عشرتی خاص ست ہردم عام را
دلستان در خشم غالبؔ بوسہ جوے شوق نشناسد ہمے ہنگام را

برنمی آید ز چشم از جوشش حیرانی مرا   شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا
دہ کہ پیش از من بپابوس کسی خواہد رسید   سجدۂ شوقی کہ می بالد بہ پیشانی مرا
برنیایم با روانیہاۓ طبعِ خویشتن   موجِ آب گوہر من کردہ طوفانی مرا
خویش را چون موج گوہر گرچہ گرد آوردہ ام   دل پُرست از ذوق انداز پرافشانی مرا
تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جان دہم   گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

از وہم قطرہ گیست کہ در خود گمُیم ما   امّا چو وارسیم ہمان قلزمیم ما
مردم بہ کینہ تشنہ خون ہمند و بس   خون می خوریم چون ہم ازین مَردمیم ما
پنہان بہ عالمیم ز بس عینِ عالمیم   چون قطرہ در روانیٔ دریا گمیم ما

نشستن بر سر راہ تحیّر عالمے دارد   کہ ہر کس میرود از خویش میگردد دو چار ما
فروزد ہر قدر رنگِ گل افزاید تب و تابش   کباب آتش خویش ست پنداری بہار ما

ببیابانِ محبت یاد می آرم زمانی را   کہ دل عہد وفا نابستہ دادم دلستانی را

خوش وقتِ اسیری کہ برآمد ہوس ما   شد روز نخستین سَبدِ گل قفس ما

در دہر فرو رفتۂ لذّت نتوان بود   بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما
باشد کہ بدین سایہ و سرچشمہ گرایند   یاران عزیزاند گروہی ز پس ما
خرسندی غالبؔ بنود زین ہمہ گفتن   یکبار بفرمائے کہ اے ہیچکس ما

زپیکانہائی ناوک در دلِ گرمم نشان بنوَد   بریگیستان چہ جوئی قطرہ ہائے آب باران را
کف خاکیم از ما بر نخیزد جز غبار آنجا   فزوں از صرصری نبود قیامت خاکساران را
نگشت از سجدۂ حق جبہۂ زہّاد نورانی   چنان کافروخت تاب بادہ روئے بادہ خواران را
دریغ آگہیے کافسردگی گردد سرو برگش   ز مستی بہرہ جز غفلت نباشد ہوشیاران را

چمن طراز جنونیم و دشت و کوہ از ماست   بہ مُہرِ داغِ شقائق بود قبالۂ ما
ہمیں گداختنست آبروئے ما غالبؔ   گُہر چہ ناز فروشد بہ پیش ژالۂ ما

چو غنچہ جوشش صفای تنش ز بالیدن   دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را
ز ظرف غالبؔ آشفتہ گر نہ آگاہ   بیا ز ما بہ مئِ تند ہوشش و ہنگش را

رازِ غربت از بد آموز تو میجوئیم ما   از تو می گوئیم گر با غیر می گوئیم ما
راز عاشق از شکست رنگ رسوا می شود   با وجودِ سخت جانیہا تنک روئیم ما

زحمتِ احباب نتوان داد غالب بیش ازین   ہرچہ مے گوئیم بہر خویش مے گوئیم ما

شوخی کہ خود ز نام وفا ننگ داشتی
بر باد میدہد بوفا نام و ننگ را

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوی اوست
آمیختن ببادۂ صافے گلاب را

ندارم شکوہ از غم با ہجوم شوق خرسندم   زجا برداشت جوش دل ہمانا داغِ ہجراں را
تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنارستم   زراہم باز چین دام نوازشہای پنہاں را

بخلوت مژدۂ نزدیکی یارست پہلو را   فریب امتحان پاکبازی دادہ ام او را
جہان از بادہ و شاہد بدان ماند کہ پنداری   بدنیا از پس آدم فرستادند مینو را
نباشد دیدہ تا حق بین مدہ دستوریٔ اشکش   چو گوہر سنج کو پیش از گہر سنجد ترازو را

حسرت وصل از چہ رو چون بخیال سرخوشیم   ابر اگر بایستد بر لبِ جوست کشتِ ما
بادہ اگر بود حرام بذلہ خلافِ شرع نیست   دل نہ نہی بخوب ما طعنہ مزن بزشت ما

آید بچشم روشنیٔ ذرہ آفتاب   بر ہر زمین کہ طرح کنی نقش پائے را
حُسن بُتان ز جلوۂ ناز تو رنگ داشت   بیخود بہ بوئے بادہ کشیدیم لائے را
مُردَم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم   یارب کجا بَرم لبِ خنجر ستائے را

با اضطرابِ دل ز ہر اندیشہ فارغم
آسائشیست جنبشِ این گاہوارہ را

قضا آئینہ دارِ عجز خواہد نازِ شاہی را   شکستے در نہادستی ادائے کجکُلاہی را
طبیعی نیست ہر جا اختلاط از وے حذر خوشتر   کم از سوزندہ آتش نیست آبِ گرم ماہی را
شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جادہ ناپیدا   ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی را

چشم بر تازگیِ شورِ جنون دوختہ ست   در خزان بیش بود مستیِ دیوانۂ ما
مَی باندازہ حرام آمدہ ساقی برخیز   شیشۂ خود بشکن بر سرِ پیمانۂ ما

قضا در کارہا اندازۂ ہر کس نگہدارد   بقطعِ وادیٔ غم می گمارد تیز گامان را
بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در طاعت   تو دانی تا بہ لُطف از خاک برداری گدایان را

جہان را خاصی و عامیست آن مغرور و این عاجز   بیا غالبؔ ز خاصان بگزرو بگزار عامان را

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را   دلی در خویش بینم کارگر جادوئے آنان را
مرنج از ناروائی بے نیازی عالمی دارد   حکایتہا بُوَد با خویشتن مر بے زبانان را
نداند قدر غم تا در نماند کس بدان غالبؔ   مسرّت خیزد از تقلیدِ پیران نوجوانان را

خیز و بیراہہ روی را سرِ راہی دریاب   شورش افزا نگہِ حوصلہ گاہی دریاب
عالم آئینۂ رازست چہ پیدا چہ نہان   تابِ اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب
گر بہ معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کمست   خم زلف و شکنِ طرفِ کلاہی دریاب
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار   نیست گر صبح بہاری شبِ ماہی دریاب
غالبؔ و کشمکش بیم و امیدش ہیہات   یا بہ تیغی بکُشش و یا بہ نگاہی دریاب

شیوہ ہا دارد و من معتقد خوئے وَیَم   شوقم از رنجش او گر بفزاید چہ عجب
چون کَشَد می کُشدَم رشک کہ در پردۂ جام   از لبِ خویش اگر بوسہ رباید چہ عجب
طرّۂ درہم و پیراہنِ چاکش نگرید   اگر از ناز بخود ہم نگراید چہ عجب
کار با مطربۂ زُہرہ نہادی دارم   گر لبم نالہ بہ ہنجار سَراید چہ عجب
آنکہ چون برق بیکجائی نگیرد آرام   گلہ اش در دل اگر دیر نپاید چہ عجب

بذوقِ وعدہ سامانِ نشاطی کردہ پندارم
زفرشِ گُل بروئے آتشم بنشاندہ است امشب
بخوابم میرسد بندِ قبا واکردہ از مستی
ندانم شوقِ من بروے چہ افسوں خواندہ است امشب
خوشست افسانۂ دردِ جُدائی مختصر غالب
بہ محشر میتوان گفت انچہ در دل ماندہ است امشب

ازاندُہِ نایافت قلق میکنم امشب
گر پردۂ ہستیت کہ شق میکنم امشب
ہان آئینہ بگزار کہ عکسم نفریبد
نظارۂ یکتائیِ حق میکنم امشب
جان بَرلبم اندازۂ دریاکشیم نیست
از مَی طلبِ سدّ رمق میکنم امشب
نازم سخنش را و نیابم دہنش را
خوش تفرقہ در باطل و حق میکنم امشب
غالبؔ نبود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمی ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

سحر دمیدہ و گُل در دمیدنست مخسپ
جہاں جہاں گُلِ نظارہ چیدنست مخسپ
مشام را بہ شمیم گلے نوازش کن
نسیم غالیہ سا در وزیدنست مخسپ
ستارۂ سحری مژدہ سنجِ دیداریست
ببین کہ چشمِ فلک در پریدنست مخسپ
تو محوِ خواب و سحر در تاسف از انجم
بہ پشت دست بدندان گزیدنست مخسپ
نفس زنالہ بہ سُنبل درودنست بخیز
زخونِ دل مژہ در لالہ چیدنست مخسپ
نشانِ زندگیِ دل دَویدنست ہالیست
جلائے آئینۂ چشم دیدنست مخسپ

زدیده سودِ حریفان کشودنست مَبَند   زدل مرادِ عزیزان تپیدنست مخسپ
بذکر مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست   گرت فسانۂ غالبؔ شنیدنست مخسپ

گُلشن بفضائے چمن سینۂ ما نیست   ہر دل کہ نہ زخمی خورد از تیغ تو وَا نیست
میسوزم و می ترسم از آسیب زدانش   آوخ کہ در آتش اثرِ آبِ بَقا نیست
عمری سپری گشت و ہماں بر سرِ جورست   گویند بتان را کہ وفا نیست چرا نیست
جنّت نکند چارۂ افسردگیٔ دِل   تعمیر باندازۂ ویرانئ ما نیست
ہر مرحلہ از دہر سرابست لبے را   کز نقش کفِ پائے کسی بوسہ ربا نیست
از ناز دلِ بے ہوسِ ما نہ پسندید   دل تنگ شد و گفت دریں خانہ ہوا نیست
دریوزۂ راحت نتوان کرد ز مرہم   غالبؔ ہمہ تن خستۂ یارست گدا نیست

عکس تنش را در آب لرزہ بود ہم زموج   بیم نگاہ خودش کار گر افتادہ است
آن ہمہ آزادگی وین ہمہ دلدادگی   حیف کہ غالبؔ زخویش بیخبر افتادہ است

حُسن تو در حجاب ز شرم گناہِ کیست   جا بر کرشمہ تنگ ز جوشِ نگاہِ کیست
ما با تو آشنائ و تو بیگانۂ ز ما   آخر تو ئ خدا کہ جہانی گواہ کیست
رشک آیدم بروشنئ دیدہ ہائے خلق   دانستہ اَم کہ از اثرِ گردِ راہِ کیست

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناهِ من   دانسته دشنه تیز نکردن گناهِ کیست

یاد از عدو نیارم وین هم ز دوربینیست   کاندر دلم گزشتن با دوست همنشینیست
در عالم خرابی از خیل منعمانم   سیلم برخت شوئی برقم بخوشه چینیست
سوزم دمی که یارم یاد آورد که غالب   در خاطرش گزشتن با غیر همنشینیست

ناز سرمایۂ دیگر ز تو یافت   نمکِ خوانِ تو خوانِ نمکست
نطق من مایۂ من بس غالب   خود نمک گوهر کانِ نمکست

مگر ز پارۂ سنگم که ریزدت دم تیغ   بجش مترس که در سود من زیانِ تو نیست
دلم بعهد وفائی فریفت نامه سپار   خوش ست وعدۂ تو گرچه از زبانِ تو نیست
روان فدائی تو نام که بَردۂ ناصح   زهی لطافت ذوقیکه در بیانِ تو نیست
گمان زیست بود بر مَنَت ز بیدردی   بدست مرگ ولی بدتر از گمانِ تو نیست

ایکه گفتی غم درونِ سینه جانفرساست هست   خامشیم امّا اگر دانی که حق باماست هست
این سخن حق بود و گاهی بر زبانِ ما نرفت   چون تو خود گفتی که خوبازار دل از خاراست هست
هم وفا هم خواهشِ ما هیچ پرسش عیب نیست   آنکه میگفتی که خواهش در وفا بیجاست هست

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتشست   بعد ازین گویند آتش را کہ گویا آتشست
انتظارِ جلوۂ ساقی کبابم میکند   می بساغر آبِ حیوان و بہ مینا آتشست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست   قعرِ دریا سلسبیل و روئی دریا آتشست
پاک خور امروز و زنہار از پیٔ فردا مست   در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتشست
گشتہ ام غالبؔ طرف با مشربِ عرفی کہ گفت   روئی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتشست

بیا کہ فصل بہارست و گُل بہ صحنِ چمن   کشادہ روئی تراز شاہدان بازارست
ز آفرینشِ عالم غرض جُز آدم نیست   بگردِ نقطۂ ما دَور ہفت پرکارست

سموم وادیٔ امکان زبس جگر تابست   گداز زہرۂ خاکست ہر کجا آبَست
مرنج از شب تار و بیا بہ بزمِ نشاط   کہ پنبۂ سر مینائی بادہ مہتابست
ز وضع روزنِ دیوار میتوان دانست   کہ چشمِ غمکدۂ ما براہ سیلابست
توی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالبؔ   ندیدۂ کہ سوئے قبلہ پُشت محرابست

نازم نگہ شرم کہ دِلہا ز میان برد   ز انسان کہ خود آن چشم فسوں ساز ندانست
مخمور مکافات بہ خلد و سقر آویخت   مشتاق عطا شعلہ ز گُل باز ندانست

ہر ذرہ محو جلوۂ حُسن یگانہ ایست   گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست
ناچار با تغافل صَیّاد ساختم   پنداشتم کہ حلقۂ دام آشیانہ ایست
پابستۂ نورد خیالی چو وارسے   ہر عالمے ز عَالم دیگر فسَانہ ایست
در پردۂ تو چند کشم ناز عالمے   داغم ز روزگار و فراقت بہانہ ایست

ہر چہ فلک نخواستست ہیچکس از فلک نخواست   ظرف فقیہ می نجُست بادۂ ما گزک نخواست
غرقہ بموجہ تاب خورد تشنہ ز دجلہ آب خورد   زحمتِ ہیچیک نداد راحتِ ہیچ یک نخواست
جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز   ہم محکِ تو زر ندید ہم زرِ من محک نخواست
زاہد و ورزش سجود آہ ز دعویٰ وجود   تا نزد اہرمن رہش بدرقۂ ملک نخواست
بحث و جَدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں   کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست
خرقہ خوش ست در بَرم پردہ چنیں خشن خوش ست   عشق بخار خار غم پیرہنم تنک نخواست
رند ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود   لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مُشترک نخواست
سہل شمرُد و سرسَری تا تو ز عجز نشمرے   غالبؔ اگر بداوری داد خود از فلک نخواست

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر   آہستہ پا نہم کہ سر خار نازک ست
از جنبشِ نسیم فرو ریزدی ز ہم   ما را چو برگ گل در و دیوار نازک ست

میرنجد از تحمّل ما بر جفائے خویش   ہان شکوۂ کہ خاطرِ دلدار نازک ست

تا در آب افتادہ عکس قدّ دلجویش   چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانیہاست
کشتۂ دلِ خویشم کز ستمگران یکسر   دید دلفریبی ہا گفت مہربانیہاست
ایکہ اندرین وادی مژدہ از ہما دادی   بر سرم ز آزادی سایہ راگرانیہاست
ذوقِ فکرِ غالبؔ را بُردہ ز انجمن بیرون   با ظہوریؔ و صائبؔ محوِ ہم زبانیہاست

سرگرمی خیال تو از نالہ باز داشت   دل پارہ آتشیست کہ دودش نماندہ است
داد از تظلمے کہ بگوشت نمیرسد   آہ از توقعی کہ وجودش نماندہ است
دِل را بوعدۂ ستمی میتوان فریفت   نازی کہ بر وفائے تو بودش نماندہ است
دل جلوہ میدہد ہُنرِ خود در انجمن   رحمی مگر بجانِ حسُودش نماندہ است
غالبؔ زبان بریدہ و آگندہ گوش نیست   اما دماغِ گفت و شنودش نماندہ است

بیخود بزیرِ سایۂ طُوبےٰ غنودہ اند   شبگیرِ رہروان تمنّا بلند نیست
غالبؔ من و خدا کہ سر انجام برشگال   غیر از شراب و انبہ و بر فاب و قند نیست

منع ما از بادہ عرضِ احتسابی بیش نیست   محتسب افشردۂ انگور آبی بیش نیست

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گزشت　　رشتۂ عمرِ خضر مدّ حسابی بیش نیست
قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون است و بس　　این من و مائی کہ می بالد حبابی بیش نیست
خویش را صورت پرستان ہرزہ رُسوا کردہ اند　　جلوہ می نامند و در معنی نقابی بیش نیست
نامہ بر از پیشگاہِ نازِ مکتوبِ مرا　　پاسخی آوردہ ست امّا جوابی بیش نیست
جلوہ کن منت منہ از ذرّہ کمتر نیستم　　حُسن با این تابناکی آفتابی بیش نیست
چند رنگین نکتۂ دلکش تکلّف بَرطرف　　دیدہ ام دیوانِ غالب انتخابی بیش نیست

شہرئ دل نیست گر حسرت مرا اینجا از چہ رو　　چشمِ اہلِ دل زباندانِ نگاہِ سائلست
با ہمہ نزدیکی از وی کام دل نتوان گرفت　　تشنۂ ما بر کنارِ آب جو پا در گلست
عقل در اثبات وحدت خیرہ میگردد چرا　　ہرچہ جُز ہستیست ہیچ و ہرچہ جُز حق باطلست
ما ہمان عین خودیم امّا خود از وہم دوئی　　درمیان ما و غالب ما و غالب حائلست

در مژدہ زجوئے عسل و کاخ زمرّد　　چیزے کہ بہ دل بستگی ارزد مئے نابست
ہم چشمئ آئینہ نگند از نظر ما　　مارا کہ ز بیداریِ دل دیدہ بخوابست

خیزو در دامن بادِ سحر آویز بہ عذر　　گر شبت تیرہ بداغ مژہ نکشودن رفت
بر تنک مایگیم رحم کہ یک عُمر گناہ　　ہم بتاراجِ سبکدستیِ بخشودن رفت

شست و شو مشغلۂ شوخیِ ابر کرمست   دژم آن خرقہ کہ با داغ نیالودن رفت
مدعی خواست رود بر اثرِ من غالبؔ   ہرچہ زو بود بسودائے چو من بودن رفت

زہے لطافتِ پرواز سعیٔ ابر بہار   کہ ہر چہ در دلِ بادست از زمین پیداست
عیار فطرتِ پیشینیان زما خیزد   صفائے بادہ ازین دُردِ تہ نشین پیداست
زہے شکوہ تو کاندر طراز صورت تو   زخود برآمدنِ صورت آفرین پیداست
نہادِ نرم ز شیرینیِ سخن غالبؔ   بسانِ موم ز اجزائے انگبین پیداست

ہرگونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم   دُردِ تہِ پیالۂ اُمیّد بودہ است
حق راز خلق جو کہ نوآموزِ دید را   آئینہ خانہ مکتبِ توحید بودہ است

یار در عہد شبابم بکنار آمد و رفت   ہمچو عیدی کہ در ایّام بہار آمد و رفت
شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگراند   روزِ روشن بوداعِ شبِ تار آمد و رفت
ہرزہ مشتاب و پیٔ جادہ شناسان بردار   اے کہ در راہِ سخن چون تو ہزار آمد و رفت
ہلہ غافل ز بہاران چہ طمَع داشتۂ   گیر کامسال برنگینیٔ پار آمد و رفت

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ ست   جرعہ را دین عوض آرید مَی ارزان شدہ است

در دلش جوئی و در دیر و حَرم نشناسی   تا چه رُوداد که در زاویه پنهان شده است

فغان که برقِ عتابِ تو آن چنانم سوخت   که راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت
شنیدهٔ که بآتش نسوخت ابراهیم   ببین که بے شرر و شعله میتوانم سوخت
مرا دمیدنِ گُل در گمان فگند امروز   که باز بر سرِ شاخِ گُل آشیانم سوخت
نفس گداختگی ہائے شوق را نازم   چه شمع ہا بسُرا پردهٔ بیانم سوخت
نویدِ آمدنت رشک از قفا دارد   شگفته روئیِ گلہائے بوستانم سوخت
کسی درین کفِ خاکسترم مباد انباز   چه شد گر آتشِ ہمسایه خانُمانم سوخت
سخن چه عطرِ شرر بر دماغ زد غالب   که تابِ عطسهٔ اندیشه مغزِ جانم سوخت

گفتم بروزگار سخنور چو من بسیست   گفتند اندرین که تو گفتی سخن بسیست
معنیِ غریب مدّعی و خانه زادِ ماست   هر جا عقیق نادر و اندر یمن بسیست
در صفحه نبودم همهٔ آنچه در دلست   در بزم کمترست گل و در چمن بسیست

به رنج از پئے راحت نگاهداشته اند   ز حکمتست که پای شکسته در بندست
نگفتهٔ که به تلخی بساز و پند پذیر   برو که بادهٔ ما تلخ تر ازین پندست
نه آن بود که وفا خواہد از جہان غالب   بدین که پرسد و گوید ہست خرسندست

شہ بہ گدا کجا رسد زانکہ چو فتنہ روئی داد   خاتمِ دست دیو بُرد کشورِ دل پَری گرفت
ای کہ دلت زغصہ سوخت شکوہ نہ درخورِ وفاست   وَرنَبَرَد آنکہ سرکنی گیر کہ سرسری گرفت

نازم بفریبی کہ دہی اہلِ نظر را   کز بوسہ پیامی بدہانست و دہان نیست
سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا   سودیست کہ مارا بزیانست وزیان نیست
در ہر مژہ برہمزدن این خلق جدیدست   نظارہ سگالد کہ ہمانست وہمان نیست
در شاخ بُوَد موج گل از جوشِ بہاران   چون بادہ بہ مینا کہ نہانست ونہان نیست
ناکس زتنومندی ظاہر نشود کس   چون سنگ سرہ کہ گرانست وگران نیست
پہلو بشگافید و بہ بینید دلم را   تا چند بگویم کہ چسانست وچسان نیست
غالبؔ ہلہ نظّارگی خویش توان بود   زین پردہ برون آ کہ چنانست وچنان نیست

دل برد و حق آنست کہ دلبر نتوان گفت   بیداد توان دید و ستمگر نتوان گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتوان خواند   ہموارہ تراشد بُت و آزر نتوان گفت
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتوان گفت
آن راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است   بردار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت
کاری عجب افتاد بدین شیفتہ مارا   مومن نبُوَد غالبؔ و کافر نتوان گفت

مشاطه به آرایشِ آن حسنِ خداداد	گل در چمن و قند به بنگاله فرو ریخت
در قالبِ ملا اثرش پرده کشا شد	خاکی که قضا در تنِ گوساله فرو ریخت
دُزدیده سرِ اهلِ سخن از بیمِ تو غالب	گوئی رگِ ابرِ قلمت ژاله فرو ریخت

گُل فراوان بود و مَی پر زور و دوشم بر بساط	خود بخود پیمانه میگردید و گردیدن نداشت
برد آدم از امانت هرچه گردون بر نتافت	ریخت مَی بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

ببین که در گل و مُل جلوه گر برائی تو کیست	مپوش دیده ز حق طالبِ رضائی تو کیست
کلید بستگیِ تست غم بجوش اے دل	تو گر چنین بگدازی گره کشائی تو کیست
بَلا بصورتِ زلفِ تو رو بما آرد	به بندِ خصمی ز هریم مبتلائی تو کیست
فرشته معنیِ مَنْ سَرَّبُكَ نمی فهمم	بمن بگوئی که غالب بگو خدائی تو کیست

به وادئی که دران خضر را عصا خفتست	بسینه می سُپرم ره اگرچه پا خفتست
هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز	گسسته لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
دلم به سبحه و سجّاده و ردا لرزد	که دزدِ مَرحله بیدار و پارسا خفتست
درازیِ شب و بیداریِ من اینهمه نیست	ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

دگر ز ایمنیِ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

مستی اندازِ لغزشی دارد حیف پائے کہ آفتش ز سرست
عقل و دین بردۂ دل و جان نیز آنچہ از ما نبردۂ خبر ست
شہ حریر و گدا پَلاس برُید آنچہ من قطع کردہ ام نظر ست
قفس و دام را گناہے نیست ریختن در نہادِ بال و پر ست
ریزَد آن برگ و این گل افشانَد ہم خزان ہم بہار در گزر ست
کم خود گیر و بیش شو غالب قطرہ از ترکِ خویشتن گہر ست

نہ بدر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت
پایم از گرمیٔ رفتار نیسوخت براہ در قدم سوختنِ خارِ بیابانم سوخت
دیگر از خاتمۂ کفر چگویم غالب من کہ رخشندگیِ جوہرِ ایمانم سوخت

در بذل لآلی وَرَقم دستِ کریم ست نی نی نَیِ کلکم رگِ مژگانِ یتیم ست
بختم ندہد کامِ دلِ غمزدہ غالب گوئی لبِ یارست کہ در بوسہ لئیم ست

مستم ز خونِ دل کہ دو چشمم ازان پُرست گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست
یا دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام داند کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست
دلخستۂ غمیم و بوَد مے دوائے ما با خستگان حدیثِ حلال و حرام چیست
در روز تیرہ از شب تارم نماند بیم چون صبح نیست خود چہ شناسم کہ شام چیست
از کاسۂ کرام نصیب ست خاک را تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست
نیکی ز تست از تو نخواہیم مزدِ کار ور خود بدیم کارِ تو ایم انتقام چیست
غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخِ مے لالہ فام چیست

چون اصل کار در نظرِ ہمنشین نبود بیچارہ خردہ بر روشِ جستجو گرفت
لطفِ خدای ذوقِ نشاطش نمیدہد کافر دلی کہ با ستمِ دوست خو گرفت
شرمندۂ نوازشِ گردون نماندہ ام گر چاک دوخت جامہ بمزدِ رفو گرفت
از یک سبوست بادہ و قسمت جدا جداست جمشید جام بُرد و قلندر کدو گرفت
فرمان روا نگشت مسلمان بہیچ عصر گر رفت مغ ز میکدہ ترسا فرو گرفت
رضوان چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد بیچارہ باز داد و مۓ مشک بو گرفت

ز سردیِ نفسِ نامہ بر توان دانست کہ نارسیدہ پیام مرا جوابی ہست

زسردمہرئے ایّام نیستیم نژند   کہ در خرابۂ ما روئی آفتابی ہست
بہار ہند بُوَد برشگال ہان غالب   درین خزان کدہ ہم موسم شرابی ہست

حریفِ ما ہمہ بے بدلہ مَی خورد غالب   مگر ز خلوتِ واعظ بہ محفل افتادست

ما و خاکِ رہ گزر بر فرقِ عریان ریختن   گل کسی جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست
در پرستش ستم و در کامجوئی استوار   بادشہ را بندۂ کم خدمت پرخوار ہست
راز دیدنہا مجوی واز شنیدنہا مگوے   نقشہا در خامہ و آہنگہا در تار ہست
کہنہ نخلے تازہ از صرصر زپا افتادہ ام   خاکم ار کاوی ہنوزم ریشہ در گلزار ہست

اے کہ خوی تو ہیچو روی تو نیست   دیدہ از دل امیدوار ترست
خستہ از راہ دور مے آیم   پا ز تن پارہ فگار ترست

رموزِ دین نشناسم درست و معذورم   نہادِ من عجمی و طریقِ من عَربیست
نشاطِ جم طلَب از آسمان نہ شوکتِ جم   قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبیست
بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع   نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبیست

نہ ہم پیالگیِ زاہدان بلائے بُوَد   خوشست گرمیِ مجلس خلافِ شرع نیست
ہرانچہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست   عیار بیکسے ما شرافتِ نسبیست
میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی   بیا بہ لابہ کہ ہیجان قوتِ غضبیست

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست   کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست
ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہان ما را   قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست
سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ   نہ ہرچہ دزد ز ما بُرد در خزانۂ تست
مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیماست   نہ تیز گامئ توسن ز تازیانۂ تست
ترا کہ محو سخن گسترانِ پیشینی   مباش مُنکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

محو خودست لیک چو من درین چہ بحث   او چون خودی نداشتہ دشمن درین چہ بحث
افسانہ گوست غیر چہ مہر افگنے برو   غم برنتابد این ہمہ گفتن درین چہ بحث
بُت را بجلوہ دیدہ و برجائی مانداست   گر بحث می کنم بہ برہمن درین چہ بحث
بعد از حزین کہ رحمتِ حق بر روانش باد   ما کردہ ایم پرورشِ فن درین چہ بحث
او جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام   عرفی کسیست لیک نہ چون من درین چہ بحث

نقشم گرفتہ دوست نمودن چہ احتیاج آئینۂ مرا بزدودن چہ احتیاج
با پیرہن زناز فرو می رود بہ دل بند قبائے دوست کشودن چہ احتیاج
در دست دیگریست سفید و سیاہ ما با روز و شب بعربدہ بودن چہ احتیاج
آن کن کہ در نگاہ کساں محتشم شوی بر خویش ہم ز خویش فزودن چہ احتیاج

جلوہ میخواہیم آتش شو ہوائے ما مسنج دستگاہ خویش بیں و مدعائے ما مسنج
در گزر زیں پردہ چوں دمساز غالب نیستی مدعی ہنجار خود گیر و نوائے ما مسنج

در پردہ شکایت ز تو داریم و بیان ہیچ زخم دل ما جملہ دہانست و زبان ہیچ
تن پروری خلق فزودن شد ز ریاضت جز گرمی افطار ندارد رمضان ہیچ
پیمانۂ رنگیست دریں بزم بگردش ہستی ہمہ طوفان بہارست خزان ہیچ
عالم ہمہ مرآت وجودست عدم چیست تا کار کند چشم محیطست و کران ہیچ
غالب ز گرفتاری اوہام بروں آی باللہ جہاں ہیچ و بد و نیک جہاں ہیچ

اے ہوس کارت ز گستاخی بہ بیرحمی کشید نازکیہاے میانش بیں بہ بالائش مپیچ
بیش ازیں کَی بود اینہم اتفاقی بودہ است اینقدر بر خود ز رنجشہاے بیجائش مپیچ

آفتابیم بہم دشمن و ہمدرد اے شمع
ماہلاک سر شامیم و تو داغ دم صبح
پیش ازیں بادِ بہار ایں ہمہ سرمست نبود
شبنم ماست کہ تر کردہ دماغ دم صبح
حق آن گرمی ہنگامہ کہ دارم بشناس
اے کہ در بزم تو ماتم ز چراغ دم صبح
غالبؔ امروز بوقتی کہ صبوحی زدہ ام
چیدہ ام ایں گل اندیشہ ز باغ دم صبح

در فصل دی گذشتہ جہان ز مہریر از و
بنشین کہ آب گردش ساغر کنیم طرح
تا چند نشنوی تو ما حسب حال خویش
افسانہ ہائے غیر مکرر کنیم طرح
آئین برہمن بنہایت رساندہ ایم
غالبؔ بیا کہ شیوۂ آزر کنیم طرح

خواہش وصل خود از غیر ز اخلاص مسنج
کاین گدائیست بدریوزۂ درہا گستاخ
شاد گردم کہ بخلوت رسیدست رقیب
بینمش چون بتو در راہ گزرہا گستاخ
تا زدلہاے نزارش چہ محابا باشد
سر زلفے کہ بہ پیچد بکمرہا گستاخ

کفیل ہوش خودم وقت مَی ببزم حبیب
بشرط آنکہ ز یک قلزمم فزوں ندہد
شریک کار نیاورد تاب سختی کار
جواب نالۂ ما غیر بے ستوں ندہد
بمن گرائے و وفا جو کہ سادہ برہمنم
بسنگ ہر کہ دہد دل بغمزہ چوں ندہد

بروئی عقدۂ کارم بشکلِ برگ خزاں   ز لرزہ ناخنِ دستِ گرہ کشا ریزد
شباب و زہد چہ ناقدردانی ہستیست   بلا بجان جوانان پارسا ریزد
بسجدہ بر در یار اوفتیم تا غالب   خطِ جبیں چو غبار از جبین ما ریزد

بہ بندِ پرسشِ حالم سخن توان افتاد   توان شناخت ز بندی کہ بر زبان افتاد
حدیثِ می بدف و چنگ در میان داریم   کنون کہ کار بہ شیخ نہفتہ دان افتاد
فرو نیامدم از بسکہ بے خودم بطلب   ہزار بار گزارم بر آشیان افتاد

غم چو ہم در افگند رو کہ مراد میدہد   دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد میدہد
آخر منزل نخست خوئ تو راہ میزند   اول منزل دگر بوئے تو زاد میدہد
اے کہ بدیدہ نم ز تست وی کہ بسینہ غم ز تست   نازشِ غم کہ ہم ز تست خاطر شاد میدہد
مست عطای خود کند ساقی ما نہ مست می   دادہ زیاد می برد بسکہ زیاد میدہد
میدہیم بہ خلد جا رحم کجاست اے خدا   آب و ہوائی این فضا کوئی کہ یاد میدہد

دل اسباب طرب گم کردہ در بندِ غمِ نان شد   زراعتگاہ دہقان شود چون باغ ویران شد
جنون کردیم و مجنون شہرہ گشتیم از خردمندی   برون دادیم رازِ غم بعنوانی کہ پنہان شد

فراغت بر نتابد همتِ مشکل پسندِ من   زدشواری بجان می افتدم کاری که آسان شد
زنا گرست این هنگامه بنگر شورِ هستی را   قیامت می دمد از پردهٔ خاکی که انسان شد
قضا از ذوقِ معنی شیرهٔ می ریخت درجاها   نمی از لای پالایش چکید و آبِ حیوان شد
چو اسکندر زنادانی هلاکِ آبِ حیوانی   خوشا سوهن که هرکس غوطه زدروے تنش جان شد
خدارا اے بتان گردش گردیدنی دارد   دریغا آبروے دیر گر غالب مسلمان شد

هجو رازی که بمستی ز دل آید بیرون   در بهاران همه بوئیت ز صبا می آید
راز از سینهٔ مضراب ز زیرم بیرون   ساز عاشق ز شکستن بصدای آید
درهم افشردنِ اندام تو چون مانجواست   خنده بر تنگیِ آغوش قبا می آید
رفته در حسرتِ نقشِ قدمی عمر بسر   جادهٔ را که بسر منزلِ ما می آید
اتفاقِ سفر افتاد به پیری غالب   انچه از پائے نیامد ز عصا می آید

خوش است آنکه با خویش جز غم ندارد   دلی خوشتر است آنکه این هم ندارد
سرابی که رخشد بویرانه خوشتر   ز چشمے که پیرایهٔ نم ندارد
گلت را نوا نرگست را تماشا   تو داری بهاری که عالم ندارد
نگهدار خود را و ز آئینه بگزر   نگاهِ تو پروائی خود هم ندارد

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزه سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکده ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانه ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایتِ شاہان عجم برچیدند
بعوض خامهٔ گنجینه فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکان پشنگی بردند
به سخن ناصیهٔ فرکیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچه بردند به پیدا به نہانم دادند
ہرچه در جزیه ز گبران مے ناب آوردند
بشبِ جمعهٔ ماہ رمضانم دادند
ہرچه از دستگه پارس به یغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جمله زبانم دادند

می رمی از من و خلقی بگمانست ز تو
بیجا باش و بنشین که گمان برخیزد
گردہم شرح عتابے که بدلہا داری
دود از کارگہِ شیشه گران برخیزد
باقدت سرو چو شخصیست که ناگه یکبار
بیخود از جا ز ہجوم خفقان برخیزد
بچه گیرند عیار ہوس و عشق دگر
رسم بیداد مبادا ز جہان برخیزد
زنہار از تعبِ دوزخِ جاوید مترس
خوش بہاریست کزو بیم خزان برخیزد
عمرہا چرخ بگردد که جگر سوخته
چون من از دودهٔ آذرنفسان برخیزد
گردہم شرح ستمہائے عزیزان غالب
رسم امید ہمانا ز جہان برخیزد

گویم سخنی گرچه شنیدن نشناسد
صبحیست شبم را که دمیدن نشناسد
از بند چه بکشاید و از دام چه خیزد
ماییم و غزالی که رمیدن نشناسد
ساقی چه شگرفی کند و باده چه تندی
خون باد دماغی که رسیدن نشناسد
ما لذّتِ دیدار ز پیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد
پیوسته روان از مژه خون جگرستم
رنگیست رخم را که پریدن نشناسد
شوقم سُمے گلگون بسبو میزند امشب
پیمانه ز ساقی طلبیدن نشناسد
باللذّت اندوهِ تو در ساخته غالب
گویی همه دل گشت و طپیدن نشناسد

هردم ز نشاطم دلِ آزاد بجنبد
تا کیست درین پرده که بی باد بجنبد

خوبان نه آن کنند که کس را زیان رسد
دل بُرد تا دگر چه از آن دلستان رسد
مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
هر جا کنیم سجده بدان آستان رسد
گم شد نشانِ من چو رسیدم به کنج دیر
مانند آن صدا که بگوش گران رسد
در دام بهر دانه نیفتم مگر قفس
چندان کنی بلند که تا آشیان رسد
امید غلبه نیست به کیش مغان در آی
مَی گر به جزیه دست نداد ارمغان رسد
صاحبقرانِ ثانی اگر در جهان نماند
گفتارِ من به ثانیِ صاحبقران رسد

از نالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار   شمع خموشم و ز سرم دود میرود
فردوس جوئی عمر بوسواس دادہ را   سرمایہ نیز در ہوسِ سود میرود

دانست کز شہادتم امیّد حور بود   برگشتنم ز دین دمِ بسمل ضرور بود
رفت آنکہ ما ز حسن مدارا طمع کنیم   سر رشتہ در کفِ ارِنی گوئی طور بود
مجرم مسنج رند انا الحق سرائے را   معشوق خود نمای و نگہبان غیور بود
نازم بامتیاز کہ بگزشتن از گناہ   با دیگران ز عفو و بما از غرور بود
قطع پیام کردی و دانستم آشتیست   دلّالہ خوبروی و دلم ناصبور بود
دادی صلائے جلوہ و غالب کنارہ کرد   کو بخش آن گدا کہ ز غوغا نفور بود

ز گرمی نگہت خون دل بجوش آمد   ز شادیِ ستمت سینہ در خروش آمد
فدای شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار   بعذر خواہی رندان بادہ نوش آمد
زمام حوصلہ نگرفت و کوہکن جان داد   چہ نرم شانہ گذشت و چہ سخت کوش آمد
ترا جمال و مرا مایۂ سخن سازیست   بہار زینتِ دکّان گلفروش آمد

بعشق از دو جہان بے نیاز باید بود   مجاز سوز حقیقت گداز باید بود

چو لب ز ہرزہ نوایانِ شوق نتوان شد   چو دل ز پردہ سرایان راز باید بود
چو بزمِ عشرتیان تازہ رو توان جوشید   چو شمعِ خلوتیان جان گداز باید بود
چو شوق بال کشاید توان بخود بالید   چو ناز جلوہ گراید نیاز باید بود
بہ صحنِ میکدہ سرمست میتوان گردید   بہ کنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود
نگہ ز دیدۂ بیدار جو کہ سائل را   بہ گدیۂ طالبِ درہائے باز باید بود
بہ بر زراحتِ آزادگی خوری غالب   ترا کہ این ہمہ بابرگ و ساز باید بود

شادم بخیالت کہ ز تابم بدر آورد   از کشمکشِ حسرتِ خوابم بدر آورد
جان بر سرِ مکتوبِ تو از شوق فشاندن   از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد
ساقی نگہی تا بشناسم ز چہ جاست   آن بادہ کہ از بندِ حجابم بدر آورد
غالب ز عزیزانِ وطن بودہ ام اما   آوارگی از فردِ حسابم بدر آورد

منم بوصل بہ گنجینہ راہ یافتۂ دزدی   کہ در ضمیر نُوَدہم پاسبانش و لرزد
دگر بکامِ خود اے دل چہ بہرہ بُرد توانی   ز سادہ کہ زنی بوسہ بر دہانش و لرزد
زشیخ وجد بذوقِ نشاطِ نغمہ نیابی   گمر بدل گزرد مرگِ ناگہانش و لرزد
فغان زخجلتِ صرّافِ کم عیار کہ ناگہ   برآورند زرِ قلب از دکانش و لرزد

گراز فشاندن جان شور نیست در سر غالب   چرا بہ سجدہ نہد سر بر آستانش و لرزد

آنانکہ وصل یار ہمی آرزو کنند   باید کہ خویش را بگدازند و او کنند
می نالی از نی کہ بہ ناخن شکستہ اند   اے وائی ناخنی بدلت گر فرو کنند
آلودہ ریا نتوان بود غالبا   پاکست خرقہ کہ بمی شست و شو کنند

چون گویم از تو بر دل شیدا چہ میرود   بنگر بر آبگینہ ز خارا چہ میرود
گوئی مباد در شکن طرہ خون شود   دل زان تست از گرہ ما چہ میرود
با ما کہ محو لذت بیداد گشتہ ایم   دیگر سخن ز مہر و مدارا چہ میرود
ہفت آسمان بگردش و ما در میانہ ایم   غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

ز از شرمست کز چشم وے آسان بر نمی آید   نگاہش بادرازیہای مژگان بر نمی آید
سرت گردم بزن تیغ و دری بر روی دل بکشا   دلم تنگست کار از زخم پیکان بر نمی آید
مجو آسودگی گر مرد راہی کاندرین وادی   چو خار از پا برآید پا ز دامان بر نمی آید
برآر از بزم بحث اے جذبۂ توحید غالب را   کہ ترک سادۂ ما با فقیہان بر نمی آید

چہ عیش از وعدہ چون باور ز عنوانم نمی آید   بنوعی گفت می آیم کہ میدانم نمی آید

گزشتم زانکه بر زخم دل صدپاره خون گرید   خود اورا خنده بر چاک گریبانم نمی آید
براه کعبه زادم نیست شادم کز سبکساری   برفتن پائے بر خار مغیلانم نمی آید
دلش خواهد که تنها سوی من روی آورد لیکن   فریب همرهان دانم زنادانم نمی آید
دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوه ها دارم   گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید
ندارم باده غالب گر سحرگاهش سر راهی   به بینی مست دانی کز شبستانم نمی آید

لبم از نام تو آن مایه پرستی که اگر   بوسه بر غنچه زنم غنچه نگینِ تو شود
چون بسجد که نه آنست بکاهد از شرم   ماه یکچند ببالد که جبین تو شود
چشم و دل باخته ام داد هنر خواهد داد   آنکه چون من همه دانُ همه بینِ تو شود
کفر و دین چیست جز آلایش پندار وجود   پاک شو پاک که هم کفر تو دینِ تو شود
دوزخِ تافتهٔ هست نهادت غالب   آه ازان دم که دم باز پسینِ تو شود

خیز و در ماتم ما سرمه فرو شو از چشم   وقتِ مشاطگی حسنِ خداداد آمد
رفته بودی دگر از جا به سخن سازی غیر   منت از بخت که خاموشی ما یاد آمد
خشک و تر سوزی این شعله تماشا دارد   عشق یکرنگ کن بندهٔ آزاد آمد
تا نه دانی جگر سنگ گشودن هنر است   تیشه داند که چها بر سر فرهاد آمد
داده خونین نفسے رس خیالم غالب   رنگ بر روئے من از سیلی استاد آمد

دوش کز گردش بختم گلہ بروئے تو بود　　چشم سوی فلک و روے سخن سوئے تو بود
دوست دارم گرہی راکہ بکارم زدہ اند　　کایں ہمانست کہ پیوستہ درابروئے تو بود
شب چہ دانی ز تو در بزم بخوباں چہ گزشت　　خاصہ برصدر نشینی کہ بہ پہلوئے تو بود
ہم ازآں پیش کہ مشّاطہ بد آموز شود　　نقش ہر شیوہ در آئینۂ زانوئے تو بود
لالہ و گل دَمد از طرف مزارش پس مرگ　　تا چہا در دلِ غالبؔ ہوسِ روئے تو بود

ہم بسودائی تو خورشید پرستم آرے　　دل ز مجنوں برد آہو کہ بہ لیلا ماند
شکوۂ دوست ز دشمن نتوانم پوشید　　گر غمِ ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند
دربغل دشنہ نہاں ساختہ غالبؔ امروز　　مگزارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

ہمرہ رونق کوثر و حوران کہ دمِ مرگ　　ذوق مے ناب و ہوس روے نکو بُرد
دی رند بہنگامہ تجمل کرد عَسَس را　　می خورد و ہم از میکدہ آبی بسبو بُرد
مارا نبُوَد ہستے و اورا نبود صبر　　دستی کہ زما شست بخونِ کہ فرو بُرد
یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ رضا دہ　　تا تلخئ آن زہر توانم ز گلو برد

گردم سرِ آوازۂ آزادگے خویش　　صد رہ نہدم بند و گرفتار نداند
پیمانہ بر آں رند حرامست کہ غالبؔ　　در بیخودے اندازۂ گفتار نداند

خوشا گر گنبد چرخ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد
بریدہ ام رہ دوری کہ گر بیفشانم
بجاے گرد رواں از بدن فرو ریزد
دہد بہ مجلسیان بادہ و بنوبت من
بمن نماید و در انجمن فرو ریزد
بمن بساز و بداں غمزہ می بجام مریز
کہ ہوشم از سر و تابم ز تن فرو ریزد
رواست غالب اگر دُرّ قائلش گوئے
کہ از لبش ز روانی سخن فرو ریزد

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانیِ عمری کہ در سفر گزرد
بوصل لطف باندازۂ تحمّل کن
کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد
حریفِ منّتِ احباب نیستم غالب
خوشم کہ کار من از سعیِ چارہ گر گزرد

تا تو بہ عزمِ حرم ناقہ فگندی براہ
کعبہ ز فرشِ سیاہ مردمک احرام شد
دیگرم از روزگار شکوہ چہ در خور بود
نالہ شرر تاب شد اشک جگر فام شد

مَی بہ زُہّاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیشِ ایں قوم بشورابۂ زمزم نرسد
ہر چہ بینی بجہاں حلقۂ زنجیری ہست
ہیچ جا نیست کہ ایں دائرہ باہم نرسد

آزادگیست سازی اما صدا ندارد
از ہر چہ در گزشتیم آوازِ پا ندارد

عشقست و ناتوانی حُسنست و سرگرانی
جور و جفا نتابم مہر و وفا ندارد
اے سبزۂ سرہ از جور پا چہ نالی؟
در کیشِ روزگاران گل خوں بہا ندارد
ہر مطلعی کہ ریزد از خامہ ام فغانیست
جز نغمۂ محبت سازم نوا ندارد
جان در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد
تن در بلا فگندن بیمِ بلا ندارد
چشمی سیاہ دارد یعنی بما نہ بیند
روئے چو ماہ دارد اما بما ندارد
چوں لعلِ تُست غنچہ اما سخن نداند
چوں چشمِ تست نرگس اما حیا ندارد

خونی کہ دی بہ جیبم از و خار خار بود
امروز گل بدامنِ جلاّد میزند
زیں بیش نیست قافلۂ رنگ را درنگ
گل یک قدح بسایۂ شمشاد میزند

باید زمی ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند
"آری دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند"
خوں ریختن بجوئی تو کردار چشم ماست
مردم ترا برائے چہ خونریز گفتہ اند
نازی بصد مضائقہ عجزی بصد خوشے
گر از تو گفتہ اند زما نیز گفتہ اند
غالبؔ ترا بدیر مسلماں شمردہ اند
آری دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

گفتم گرہ ز کار دل و دیدہ باز کن
از جبہہ ناگشودہ بہ بند نقاب زد
غالب کساں ز جہل حکیمش گرفتہ اند
بیدانشے کہ طعنہ بر اہل کتاب زد

گر قضا ساز تلافی در خور عشرت کند   آہ ازاں خونابہ کاندر جام فغفور افگند
گر مسلمانی یکے بیں زرد ہشت آنکہ او   اختلافے درمیانِ ظلمت و نور افگند

نمی گیری بخون خلق بے پروا نگاہاں را   تواند بود یارب بعدِ محشر محشری باشد

دل نہ تنہا ز فراقِ تو فغاں ساز دہد   رفتنِ عکس تو از آئینہ آواز دہد
دل چو بیند ستم از دوست نشاط آغازد   شیشہ سازیست کہ تا بشکند آواز دہد
ہای پُرکاریِ ساقی کہ بہ ارباب نظر   می باندازہ و پیمانہ باندا ز دہد
چوں نناز د سخن از مرحمت دہر بخویش   کہ بَرَد عرفی و غالبؔ بعوض باز دہد

عشوۂ مرحمتِ چرخ مخر کایں عیّار   یوسف از چاہ برآرد کہ ببازار برد

جوہر طبعم درخشاں ست لیک   روزم اندر ابر پنہاں میرود
گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار   چوں رود از دست آساں میرود
جز سخن کفرے و ایمانے کجاست   خود سخن در کفر و ایماں میرود
آید واز ذوق نشاسم کہ کیست   تا رود پنداشتی جاں میرود
ہر کہ بیند در رہش گوید ہمے   قبلۂ آتش پرستاں میرود

کیست تا گوید بدان ایوان نشیں   انچہ بر غالبؔ ز دربان میرود

نومیدی ما گردش ایام ندارد   روزی کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
بلبل بچمن بنگر و پروانہ بہ محفل   شوقیست کہ در وصل ہم آرام ندارد
بوسی کہ ربایند بمستی زلب یار   نغزست ولی لذتِ دشنام ندارد

چہ خیزد از سخنے کز درون جان نَبُوَد   بریدہ باد زبانے کہ خونچکان نَبُوَد
امید بوالہوس و حسرتِ من افزوں شد   ازیں نوید کہ اندوہ جاوداں نَبُوَد
بالتفات نگارم چہ جائے تہنیت ست   دعا کنید کہ نوعی ز امتحان نبوَد
عجب بود سحر ہمخوابے کسی غالبؔ   مرا کہ بالش و بستر ز پرنیان نَبُوَد

دلستانان بہلند ارچہ جفا نیز کنند   از وفائے کہ نکردند حیا نیز کنند
خون ناکامی سی سالہ ہدر خواہد بود   مہر با ما اگر از بہر خدا نیز کنند
اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت   کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند
حلق غالبؔ بگرو دشنۂ سعدی کہ سرود   خوبرویان جفاپیشہ وفا نیز کنند

چہ ذوق رہروی آنرا کہ خارخاری نیست   مَرَو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

بباده گر بُوَدم میل شاعرم نه فقیه   سخن چه ننگ ز آلوده دامنی دارد
خوشم ببزم ز اکرام خویش وزین غافل   که می نمانده و ساقی فروتنی دارد
بیاورید گر اینجا بود زباندانے   غریبِ شہر سخنہاے گفتنی دارد

تو داری دین و ایمانی بترس از دیو و نیرنگش   چو نبُوَد توشه راہی چه باک از رہزنم باشد
بدان تا با من آویزد چو حرفِ زنگ بُو گوید   دلم با اوستی اما زبان با گلشنم باشد
بزرہمدوش قارون خفتن از دون ہمتی خیزد   بیا تا در سخن بیچیم که غالبؔ ہمفنم باشد

خانهٔ زنبور شد کلبه ام از دستِ چرخ   بسکه ز آب و گلم رغبت تعمیر بُرد

تا چند بوالہوس می و عاشق ستم کشد   کو فتنه تا بداورے ہم علم کشد
دشوار نیست چارهٔ عیش گریز پائے   دور قدح چو سلسله گر سر بہم کشد
شوقم که روشناس دلِ نازنین تست   کی منت نوشتن و نازِ قلم کشد
صہبا حلال زاہد شب زنده دار را   اما بشرطِ آنکه ہمان صبحدم کشد
از تازگی بدہر مکرر نے شود   نقشیکه کلکِ غالبؔ خونین رقم کشد

گفتند حور و کوثر و دادند ذوق کار   منعست نام شاہد و مے آشکار بُرد

می دادیدلہ جست مگر ابر وقلزمیم   کاورد قطرہ وگہر شاہوار برد
پیشم از آن برس کہ پرسی و اہل کوے   گویند خستہ زحمت خود زین دیار برد
نازم فریبِ صلح کہ غالبؔ زکوئی تو   ناکام رفت وخاطر امیّدوار برد

تنگست دلم حوصلۂ راز ندارد   آہ از نے تیر تو کہ آواز ندارد
تمکین برہمن دلم از کفر بگرداند   بُت خانہ بُتے خانہ برانداز ندارد
بے حیلہ زخوبان نتوان چشم ستم داشت   رحمست براں خستہ کہ غمّاز ندارد
کیفیتِ عَرفی طلب از طینت غالبؔ   جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد   غالبؔ آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ہر ذرہ را فلک بہ زمین بوس میرسد   گر خاک راست دعوئ ناموس میرسد
بیرون میاز خانہ بہ ہنگام نیمروز   رشک آیدم کہ سایہ بپا بوس میرسد
سجادہ رہنِ می نپزیرفت میفروش   کایں را نسب بخرقۂ سالوس میرسد

دریغا کہ کام ولب از کار ماند   سخنہائے ناگفتہ بسیار ماند
ادائیست اورا کہ از دلربائی   نہفتن زشوخے بہ اظہار ماند

ز قحطِ سخن ماندم خامہ غالبؔ   به نخلے کز آوردنِ بار ماند

ازاں سرمایۂ خوبی بوصلم کام دل جستن   بدان ماند کہ موری خرمنی را در کمیں باشد

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج   دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد
از بسکہ در کشاکشم از کار رفت دست   بندم اگر گسستن بند استوار کرد
تا می بزعم من فتد از دستِ من بخاک   افراطِ ذوق دست مرا رعشہ دار کرد
نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر   نومیدیم دگر بتو امیدوار کرد

بشرع آویز و حق میجو کم از مجنون نہ بادی   دلش با محمل است اما زباں با ساربان دارد
خدارا وقت پرسش نیست گفتم بگذر از غالبؔ   کہ ہم جان بر لب و ہم داستانہا بر زبان دارد

آں خود ببازی می برد ویں را دو جو می نشمرد   بنمودمش دیں خندہ زد آوردمش جاں خوش نکرد
با من میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر   ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد
غالبؔ بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او   ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

قدر مشتاقاں چہ داند دردِ ما چندش بود   آنکہ دائم کار با دلہائے خرسندش بود

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنے باز گوے　　گفت گفتاری کہ با کردار پیوندش بود

کسی با من چہ در صورت پرستی حرف دین گوید　　زآزر گفت دانم گر ز صورت آفریں گوید
دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارۂ خواہم　　کہ با من وسعت بتخانہائی ہندو چیں گوید
بخشم نا سزا میگوید و از لطف گفتارش　　گمان دارم کہ حرفِ دلنشینی بعد ازیں گوید
چرا رانند غالبؔ را ازان دَر رہروی باید　　کہ راز خلوتِ شہ با گدائے رہ نشیں گوید

من بوفا مُردم و رقیب بَدَر زد　　نیمہ لبش انگبیں و نیمہ تبرزد
کیست درین خانہ کز خطوط شعاعے　　مہر نفس ریزہ ہا بہ روزنِ دَر زد
لشکرِ ہوشم بزور مے نہ شکستی　　غمزۂ ساقی نخست راہ نظر زد
برگِ طرب ساختیم و بادہ گرفتیم　　ہر چہ ز طبعِ زمانہ بیہُدہ سر زد
شاخ چہ بالد گر ارمغانِ گُل آرد　　تاک چہ نازد اگر صلائے ثمر زد
کام نہ بخشیدۂ گُنہ چہ شمارے　　غالبِ مسکیں بالتفات نیرزد

ترا تنیست کہ بروی سمن خسک باشد　　مرا دلیست کہ در وی نشاط غم گردد
بدیں قدر کہ لبے تر کنے و من بمکم　　ترا ز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد
سبک سریست بدریوزۂ طرب رفتن　　خوشا دلے کہ باندوہ محتشم گردد

گرفتہ خاطر غالب ز ہند و اعیانش   براں سرست کہ آوارۂ عجم گردد

سختست دل عیر و گر از ننگ نگوے   برگشتن مژگاں تو گوید کہ چہ رو داد
شائستہ ہمیں ما و تو بودیم کہ تقدیر   ما را سخن نغز و ترا روی نکو داد
ساقی دگرم بُرد بہ میخانہ ز مسجد   می یک دو قدح بود و فریبم بہ سبو داد
زیں سادہ دلی داد کہ چوں دید بخوابم   ترسیدہ خود و مژدۂ مرگم بعدو داد
حسن تو بساقی گری آئین نشناسد   مست آمد و یکبار دو ساغر زد و بو داد

تو نالی از خلۂ خار و نگرے کہ سپہر   سر حسینؑ علیؑ بر سناں بگرداند
برو بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا   چو قرعہ بر نمط امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند   کلیم را بہ لباس شباں بگرداند

گر رفتہ ام ز کوئی تو آساں نرفتہ ام   ایں قصہ از زبان عزیزاں شنیدہ باد
نغزی و خود پسند بہ بینم چہ میکنی   یارب بدہر ہجو توئی آفریدہ باد
غالبؔ شراب قندی ہندم کباب کرد   زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

در تیغ زدن منت بسیار نہادند   بُردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

داغ دل ما شعلہ فشاں ماند بہ پیری   ایں شمع شب آخر شد و خاموش نکردند
روزی کہ بہ می زور و بہ نی شور نہفتند   اندیشہ بکارِ خرد و ہوش نکردند
گر خود بغلامے نہ پذیرند گدا باش   بر دَر بزن آں حلقہ کہ در گوش نکردند
غالبؔ ز تو آں بادہ کہ خود گفت نظیریؔ   در کاسۂ ما بادۂ سر جوش نکردند

تاجر شوق بداں رہ بتجارت نرود   کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نرود
قصر و مہمانکدۂ حاتم و کسریٰ بگذار   نام از رفتن آثارِ عمارت نرود
رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد   محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

بتی دارم ز شنگی روزگاراں خوبہاراں بہ   بہ مستی خویش اگر دِ آرد گوی از ہوشیاراں بر
ندارد شیر خرما ذوقِ صہبا رحم می آید   نشاط عید از ما ہدیہ سوی روزہ داراں بر

مژدہ اے ذوق خرابی کہ بہارست بہار   خرد آشوب ترا از جلوۂ یارست بہار
شوخیٔ خوی ترا قاعدہ دانست خزاں   خوبیِ روئی ترا آئینہ دارست بہار

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر   چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردے   بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

شنیده ام کہ نہ بینی و ناامید نیَم   ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانۂ و بالید و آشیاں گہ شد   در انتظار ہُما دام چیدنم بنگر
نیاز مندے حسرت کشاں نمیدانی   نگاہ من شو و دُزدیده دیدنم بنگر
بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاب   بخلوتم برو ساغر کشیدنم بنگر

من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد   فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر
بخود شمار وفاہاے من ز مردم پرس   بمن جواب جفاہاے خویشتن یاد آر
ہزار خستۂ و رنجور در جہاں دارے   یکے ز غالبؔ رنجور خستہ تن یاد آر

عمری کہ بسوادے تو گنجینۂ غم بود   اینک بتو دادیم تو در عیش بسر بر
مطرب بغزلخوانی و غالبؔ بسماعست   ساقی مے و آلات می از حلقہ بدر بر

اے دل از گلبن امید نشانے بمن آر   نیست گر تازه گلی برگ خزانی بمن آر
یارب ایں مایۂ وجود از عدم آوردۂ تست   بوسۂ چند ہم از گنج دہانے بمن آر
سخن ساده دلم را نفریبد غالبؔ   نکتۂ چند ز پیچیده بیانے بمن آر

اے ذوق نواسنجی بازم بخروش آور   غوغای شبیخونی بر بُنگہ ہوش آور

گر خود نجہد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خون کن و آن خون را در سینہ بجوش آور
ہان ہمدم فرزانہ دانی رہِ ویرانہ
شمعی کہ نخواہد شد از باد خموش آور
شورابۂ ایں وادی تلخست اگر رادی
از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور
دانم کہ زری داری ہر جا گزری داری
می گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور
گر مغ بہ کدو ریزد برکف نہ وراہی شو
ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور
ریحان دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہ چشم افگن ایں از پئے گوش آور
گاہے بسبکدستی از بادہ زخویشم بر
گاہے بہ سیہ مستی از نغمہ بہوش آور
غالب کہ بقایش باد ہمپائے تو گر ناید
باری غزلی فردی زاں موئنہ پوش آور

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ برخاکش نگر
وان سینہ سودن از تپش برخاک نمناکش نگر
برقی کہ جانہا سوختی دل از جفا سردش ببیں
شوخی کہ خونہا ریختی دست از حنا پاکش نگر
آں کو بخلوت باخدا ہرگز نکردے التجا
نالان بہ پیش ہر کسے از جورِ افلاکش نگر
تا نام غم بردی زبان میگفت دریا در میان
دریائے خون اکنون روان از چشم سفاکش نگر
آن سینہ کز چشم جہان مانند جان بودی نہان
اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر
برآستاں دیگرے در شکر دربانش ببین
در کوی از خود کمتری در رشک خاشاکش نگر
باخوبی چشم و دلش باگرمے آب و گلش
چشم گہر بارش ببیں آہ شرر ناکش نگر
خواند بامیدِ اثر اشعارِ غالب ہر سحر
از نکتہ چینے درگزر فرہنگ و ادراکش نگر

ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہادش
بگزار و بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز

رقیب یافتہ تقریب رخ بیاسودن
ترا کہ گفت کہ از بزم سرگراں برخیز
سبوچۂ دہمت ہر سحر زمی غالب
خدای را ز سر کوچہ مغاں برخیز

با ہمہ گم گشتگی خالی بود جایم ہنوز
گاہ گاہی در خیال خویش می آیم ہنوز
تا سرِ خارِ کدامیں دشت در جاں میخلد
کز ہجوم شوق می خارد کف پایم ہنوز
خشک شد چندانکہ مَی جزو بدن شد شیشہ را
ہمچناں گوئی ز انگورست صہبایم ہنوز
بعد مردن مشت خاکم در نورد صرصرست
بیقراری میزند موج از سراپایم ہنوز
تازہ دور افتادۂ ظرفِ بساط عشرتم
میتواں افشرد می از لای پالایم ہنوز
صد قیامت در نورد ہر نفس خوں گشتہ است
من زخامی در فشار بیم فردایم ہنوز
تا کجا یارب فروشست اشک من ظلمت زخاک
لالہ بیداغ از زمیں روید بصحرایم ہنوز
با تغافل بر نیامد طاقتم لیک از ہوس
در تمنائے نگاہ بے محابایم ہنوز

لطفی بہ تحت ہر نگہ خشمگیں شناس
آرائشِ جبینِ شگرفاں زچیں شناس
آرائش زمانہ زبیداد کردہ اند
ہر خوں کہ ریخت غازۂ روے زمیں شناس
بے غم نہادِ مرد گرامی نمی شود
زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس

غالب مذاق ما نتوان یافتن زما   رو شیوهٔ نظیریؔ و طرز حزیںؔ شناس

تیغ از نیام بیہدہ بیرون نکردہ کس   ما را بہیچ کشتہ و ممنون نکردہ کس
فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پاے   کار از دوا گزشتہ و افسون نکردہ کس
یارب بزاہدان چہ دہی خلد رائیگاں   جورِ بتان ندیدہ و دل خون نکردہ کس
غالبؔ ز حسرتیؔ چہ سرائی کہ در غزل   چون او تلاشِ معنی و مضمون نکردہ کس

ہمہ محسوس بود ایزد عالم معقول   غالبؔ ایں زمزمہ آواز نخواہد خاموش

بعرض شہرتِ خویش احتیاج ما دارد   چو شعلۂ کہ نیاز او فتد بخار و خسش
ز رنگ و بوے گل و غنچہ در نظر دارم   غبار قافلۂ عمر و نالۂ جرسش
مرا بہ غیر ز یک جنس در شمار آورد   فغان کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش
جگر ز گرمی ایں جرعہ تشنہ تر گردید   فغان ز طرز فریب نگاہ نیم رسش
خوشم کہ دوست خود آنمایہ بیوفا باشد   کہ در گمان نسگالم امید گاہ کسش
بہار پیشہ جوانی کہ غالبش نامند   کنون ببیں کہ چہ خوں میچکد ز ہر نفسش

بہ خلد از سردی ہنگامہ خواہم   برافروزم بگرد کوثر آتش

بدان ماند ز شاہد دعوے مہر   کہ ریزد از دم افسون گر آتش
قمر در عقرب و غالب بدہلی   سمندر در شط و ماہی در آتش

قطرۂ خونی گرہ گردید دل دانستمش   موج زہر آبی بطوفاں زد زباں نامیدمش
غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش   کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم   کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش
بر امید شیوۂ صبر آزمائے زیستم   تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش
بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم   من ز غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش   شہید انتظار جلوہ خویشست گفتارش
بدیں سوزم رواجی نیست ہی فرہاد را نازم   کہ از تاب شرار تیشہ گرمست بازارش
بدا گر دوست زندان مرا تاریک بگزارد   بدیں حسنی کہ در گیرد چراغ از تاب رخسارش

اگر بادہ گرائے قدح ز نرگس خواہ   و گر بسبحہ ز شبنم برشتہ گوہر کش
بداں ترانہ کہ ممنوع نیست مستی کن   ازاں شراب کہ نبود حرام ساغر کش
مذاق مشرب فقر محمدؐ دار ی   مے مشاہدۂ حق بنوش و دم درکش
نشاط ورز و گہر پاش و شادمانی کن   جہاں ستان و قلمرو کشای و لشکر کش

تراکہ گفت کہ منت کشی ز چرخ کبود   بقہر کام دل خویشتن ز اختر کش

چون عکس پل بسیل بذوق بلا برقص   جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص
نبود وفای عہد دمی خوش غنیمت ست   از شاہدان بنازش عہد وفا برقص
ذوقیست جستجو چہ زنی دم ز قطع راہ   رفتار گم کن و بصداے درا برقص
در عشق انبساط بپایان نمیرسد   چون گرد باد خاک شو و در ہوا برقص
فرسودہ رسمہاے عزیزان فرو گذار   در سور نوحہ خوان و بہ بزم عزا برقص
چون خشم صالحان و ولاے منافقان   در نفس خود مباش و لے بر ملا برقص
از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوے   بیہودہ در کنار سموم و صبا برقص
غالب بدیں نشاط کہ وابستہ کہ   بر خویشتن ببال و بہ بند بلا برقص

دل در غمش بسوز کہ جان میدہد عوض   ور جان دہی غمی بہ ازان میدہد عوض
فارغ مشو ز دوست بمی در ریاض خلد   از ما گرفت انچہ ہمان میدہد عوض
سرمایۂ خرد بجنون دہ کہ این کریم   یک سود را ہزار زیان میدہد عوض
نبود سخن سرائی ما رائگان کہ دوست   دل میبرد ز ما و زبان میدہد عوض
نازم بدست سبحہ شماریکہ عاقبت   شوقش کف پیالہ ستان میدہد عوض
پاداش ہر وفا بجفاے دگر کند   غالب ببین کہ دوست چسان میدہد عوض

گوئی کہ ہاں وفا کہ وفا بودہ است شرط   آری ہمیں ز جانب ما بودہ است شرط
لب بر لبت نہادن و جان دادن آرزوست   در عرض شوق حسن ادا بودہ است شرط
تا بگذرم ز کعبہ چہ بینم کہ خود ز دیر   رفتن بہ کعبہ رو بقفا بودہ است شرط
غالبؔ بعالمی کہ توئی خون دل بنوش   از بہر بادہ برگ و نوا بودہ است شرط

تکیہ بر عہدِ زباں تو غلط بود غلط   کایں خود از طرز بیانِ تو غلط بود غلط
آنکہ گفت از من دلخستہ بہ پیش تو رقیب   کہ غلط بود بجانِ تو غلط بود غلط
غنچہ را نیک نظر کردم ادائے دارد   دیں کہ مانند بدہانِ تو غلط بود غلط
دل نہادن بہ پیام تو خطا بود خطا   کام جستن ز لبانِ تو غلط بود غلط
آخر اے بوقلموں جلوہ کجائی کاینجا   ہر چہ دانند نشانِ تو غلط بود غلط

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ   ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاک است بادہ کہ دروست   ازاں رحیق مقدّس دریں خمار چہ حظ
چنیں کہ نخل بلندست و سنگ ناپیدا   ز میوہ تا نفتد خود ز شاخسار چہ حظ
بہ بند زحمت فرزند و زن چہ می کشیم   ازیں نخواستہ غمہائے ناگوار چہ حظ

تا رغبت وطن نبود از سفر چہ حظ   آنرا کہ نیست خانہ بہ شہر از خبر چہ حظ

دلہاے مردہ راز نشاط نفس چہ کار گلہاے چیدہ راز نسیم سحر چہ حظ
تا فتنہ در نظر نہی از نظر چہ سود تا دشنہ بر جگر نخوری ز جگر چہ حظ
زانسوئی کاخ روزن دیوار بستہ اند بے دوست از مشاہدۂ بام و در چہ حظ
چوں پردۂ محافہ ببالا نمیزند از وے بداعیان سر رہگذر چہ حظ

تا الف شوق تو انداختہ جاں در تن شمع شرر از رشتۂ خویشست بہ پیراہن شمع
مجمعی از دل و جانست بگرد در دوست تودۂ از پر و بالست بہ پیراہن شمع
روزم از تیرگی آن وسوسہ ریزد بنظر کہ شب تار بہنگام فرو مردن شمع
نازم آں حسن کہ در جلوہ ز شہرت باشد خاطر آشوب گل و قاعدہ برہمزن شمع
بر نتابد ز بتاں جلوہ گرفتار، کسے صبح را کردہ ہوا داری گل دشمن شمع
می گدازم نفسے بے شرر و شعلہ و دود داغ آں سوز نہانم کہ نباشد فن شمع
وقت آرائش ایوان بہارست کہ باز کوہ از جوش گل و لالہ بود معدن شمع
غالب از ہستی خویشست عذابی کہ مراست ہم ز خود خار غم آویختہ در دامن شمع

شادم کہ بر انکار من شیخ و برہمن گشتہ جمع کز اختلاف کفر و دیں خود خاطر من گشتہ جمع
مقتول خویشاں خودم جوئید خون ریز مرا زینان کہ بر نعش منند از بہر شیون گشتہ جمع
در گریہ تا رفتم ز خود اندوہم از سر تازہ شد بر ہیئت دل لخت دل بازم بدامن گشتہ جمع

ہی ہی چہ خوش باشد بہ دی آتش بہ پیش مرغ و مے   از بذلہ سنجاں چند کس در یک نشیمن گشتہ جمع
صحبت و گوناگوں اثر غالب چہ خسپی بے خبر   نیکان بمسجد رفتہ در رندان بگلشن گشتہ جمع

اگر بہ مہر نخواندی بناز خواہے کشت   نہ ہر چہ وعدہ کنی سر بسر دروغ دروغ
دگر کرشمہ در ایجاد شیوۂ نگہیست   تو وز عربدہ قطع نظر دروغ دروغ
دریں ستیزہ ظہوری گواہ غالب بس   من وز کوئی تو عزم سفر دروغ دروغ

ہنگام بوسہ بر لب جاناں خورم دریغ   در تشنگی بچشمۂ حیواں خورم دریغ
دل زان تست ہدیۂ تن کن کنار و بوس   چند از تو بر نوازش پنہاں خورم دریغ

سعی در مرگ رقیبان گرانجان کردی   می شناسم کہ چہ از ناز و ادا گشت تلف
آمدی دیر بپرسش چہ بشارت آرم   من و عمری کہ باندوہ وفا گشت تلف
رنگ و بو بود ترا برگ و نوا بود مرا   رنگ و بو گشت کہن برگ و نوا گشت تلف
گیرم امروز دہی کام دل آں حسن کجا   اجر ناکامی سی سالۂ ما گشت تلف
کاش پاے فلک از سیر بماندی غالب   روزگاری کہ تلف گشت چرا گشت تلف

اے کردہ غرقم بیخبر شو زیں نشانہا یکطرف   زختم بساحل یکطرف کشتم بدریا یکطرف

تادل بدنیا داده ام درکشمکش افتاده ام   اندوه فرصت یکطرف ذوق تماشا یکطرف

بجز دمی نکند خستہ ام چو سنگ در آب   ہجوم ریزش غمہاے سخت و قلبِ رقیق
براہ کعبہ ہلاکم سے کنے باور   تو اے کہ بیہدہ باز آمدی زبیت عتیق
ترا بہ پہلوے میخانہ جا دہم غالبؔ   بشرط آنکہ قناعت کنی بہ بوی رحیق

بزم بادہ گریبان کشو دلش نگرید   خوشا بہانۂ مستے خوشا رعایت شوق
ہران غزل کہ مرا خود بخاطرست ہنوز   ببانگ چنگ ادامی کند زغایت شوق
دخاں ز آتش یاقوت گردمد عجبست   عجب ترست ازیں برلبش حکایت شوق
ترا ز پرسش احباب بے نیاز کند   غرور یکدلی و زنازشش حمایت شوق

مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک   از رشک تشنۂ کہ بدریا شود ہلاک
امرد را بلخلخہ آسائش مشام   مرد از تف سموم بہ صحرا شود ہلاک
غم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آں   پنہاں نشاط وَرزد و پیدا شود ہلاک

حر اگر موج زنست از خس و خاشاک چہ باک   باتو ز اندیشہ چہ اندیشہ ازباک چہ باک
شتی نیست اگر خانہ چراغے دارد   بادل از تیرگیِ زاویۂ خاک چہ باک

کلک ما تا بہ کفِ ماست ز دشمن چہ ہراس   چون فریدون علم آراست ز ضحاک چہ باک
طبعم از دخل خساں باز نہ استد ز سخن   شعلہ را غالبؔ از آویزش خاشاک چہ باک

ازیں پرسش کہ بسیارست از تو   شد اندوہ دل زارِ من اندک
ز خاصانت گرامی گوہری ہست   کہ میداند ز اسرارِ من اندک
وجودم خوان یغما بود غم را   تو ہم بروے ز بسیارِ من اندک
نگویم تا نباشد نغز غالبؔ   چہ غم گر ہست اشعارِ من اندک

اے ترا و مرا دریں نیرنگ   دہن و چشم و دست و دل ہمہ تنگ
شکوہ و شکر ہرزہ و باطل   غالبؔ و دست و آبگینہ و سنگ

نہ مرا دولت دنیا نہ مرا اجر جمیل   نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل
غالبؔ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری   بدیاری کہ ندانند نظیرے ز قتیل

زان شعر کہ در شکوۂ خوے تو سرایم   لفظم بزباں ماند و مضمون رود از دل

گفتم ز شادی بنود دم گنجیدن آسان در بغل   تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

نازم خطر ورزیدنش واں ہرزہ دل لرزیدنش   چینی ببازی بر جبیں دستی بدستاں در بغل
آہ از تنک پیراہنی کافزوں شدش تر دامنی   تا خوی بروں داد از حیا گردید عریاں در بغل
دانش بہم در باختہ خود را ز من نشناختہ   رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل
گاہم بہ پہلو خفتہ خوش بستی لب از حرف و سخن   گاہم ببازو ماندہ سر سودی زنخداں در بغل
ناخواندہ آمد صبحگہ بند قبائش بے گرہ   واندر طلب منشورِ شہ بکشودہ عنواں در بغل
ہاں غالبِ خلوت نشیں بیمی چناں عیشی چنیں   جاسوسِ سلطان در کمیں مطلوب سلطاں در بغل

برگوشۂ بساط غریب ست و آشناست   گلبن دیارِ گل بود و شاخ کوے گل
تا گل برنگ و بوے کہ ماند کہ در چمن   گل در پس گل آمدہ در جستجوے گل
زانگہ کہ عندلیب لقب دادۂ مرا   افزودۂ امید من و آبروے گل
در موسم تموز گلابے بہ تن بریز   تا آب رفتہ باز بیاید بجوے گل
غالب ز وضع طالبم آید حیا کہ داشت   ”چشمی بسوے بلبل و چشمی بسوے گل“

تن برکرانہ ضائعُ دل درمیانہ غافل   چوں غرقۂ کہ ماند رختش بسوے ساحل
راز تو در نہفتن تبخالہ ریخت بر لب   تیر تو در گزشتن پیکان گداخت در دل

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم   در بزم رنگ و بو نمطی دیگر افگنم

نخلم کہ ہم بجای رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروی زمین گوہر افگنم
بادیریان ز شکوۂ بیدادِ اہل دیں
مہری ز خویشتن بدل کافر افگنم
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
منصور فرقۂ علی اللّٰہیان منم
آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم

شعلہ چکد ز غم کر اگل شگفد مزد کو
شمع شبستانیم بادِ سحرگاہیم
دور فتادم زیار ماہی بے دجلہ ام
نیست دلم در کنار دجلۂ بے ماہیم
آن تن چوں سیم خام وانہمہ انگیز تن
تا چہ فراہم شدست اجرتِ جانکاہیم
غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہیم و ہم اسد اللہیم

برلب یا علی سرای بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم
بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ
وہ کز ہرچہ ناسزاست ہم بسزانہ کردہ ایم
ناخن غصہ تیز شد دل بستیزہ خو گرفت
تا بجود او فتادہ ایم از تو کرانہ کردہ ایم
غالب از انکہ خیر و شر جز بقضا نبودہ است
کار جہان ز پُردلی بے خبرانہ کردہ ایم

ہر قدم لختی ز خود رفتن بود در بار من
ہمچو شمع بزم در راہ فنا زادِ خودم
میدہم دل را ز بیدادت فریب التفات
سادگی بنگر کہ در دام تو صیّادِ خودم

عالم توفیق را غالبؔ سواد اعظم   مہر حیدر پیشہ دارم حیدر آبادِ خودم

خوی تو دانستم اکنون بہر من زحمت مکش   رام بودم تا دل امیدواری داشتم
دیگر از خویشم خبر نبود تکلّف برطرف   اینقدر دانم کہ غالبؔ نام یاری داشتم

دیدم آں ہنگامہ بیجا خوف محشر داشتم   خود ہمان شورست کاندر زیست در سر داشتم
تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں   آتشی در سینہ و آبے بساغر داشتم
بر سر راہش نشستم بر درش راہم نبود   خویش را از خویشتن لختی نکوتر داشتم
نامۂ شاہد دگر عنوانِ شاہی دیگرست   آنچہ ناید از ہما چشم از کبوتر داشتم
ہیچ میدانی کہ غالبؔ چوں بسر بردم بدہر   منکہ طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

پرتو مہر سیاہے زگلیمم نبرد   سایہ ام سایہ شب و روز برابر دارم
سوخت دل بے تو ز وصلم چہ کشاید اکنون   حسرتت بیشتر و ذوق تو کمتر دارم
مرحبا سوزِ تن و جاں بخشی آبش غالبؔ   خندہ بر گرمے خضر و سکندر دارم

شبہائے غم کہ چہرہ بخوناب شستہ ایم   از دیدہ نقشِ وسوسۂ خواب شستہ ایم
زاہد خوشست صحبت از آلودگی مترس   کایں خرقہ بارہا بہ مئے ناب شستہ ایم

بیدست و پا به بحر توکل فتاده ایم   از خویش گرد زحمت اسباب شسته ایم
غالبؔ رسیده ایم به کلکته و به مے   از سینه داغ دوریِ احباب شسته ایم

با تو عرض وعده ات حاشا که از ابرام نیست   هرچه میگوئی همی خواهم که تکرارش کنم
راحت خود جستم و رنج فراوان یافتم   مژده دشمن را اگر جهدی در آزارش کنم
نکته هایش بے دهن میریزد از لب غالباؔ   بیزبان گردم که شرح لطف گفتارش کنم

در عرض شوق صرفه نبردیم در وصال   در شکوه هائے خواه مخواهش گرفته ایم

تا فصلی از حقیقت اشیا نوشته ایم   آفاق را مرادفِ عنقا نوشته ایم
ایمان بغیب تفرقه ها رفت از ضمیر   ز اسما گذشته ایم و مسمیٰ نوشته ایم
در هیچ نسخه معنے لفظِ اُمید نیست   فرهنگنامه هائے تمنا نوشته ایم
آینده و گذشته تمنا و حسرت ست   یک کاشکی بوَد که بصد جا نوشته ایم
آغشته ایم هر سرِ خاری بخونِ دل   قانونِ باغبانیِ صحرا نوشته ایم
غالبؔ الف همان علمِ وحدت خود ست   بر لَا چه بر فزود گر اِلّا نوشته ایم

برتر ز بے پَرَدزی مَلَک بهرِ کسرِ نفس   خود را به بند سلسلهٔ آدم افگنم

خوشنودم از تو ز پیٔ دور باش خلق
آوازۂ جُفاے تو در عالم افگنم
دوزند گر به فرض زمیں را بآسماں
حاشا کزیں فشار در ابرو خم افگنم

گم گشته بکوی تو نه دل بلکه خبر هم
در لرزه ز خوی تو نه دم بلکه اثر هم
تا حسن به بے پردگی جلوه صلا زد
دیدیم که تاری ز نقابست نظر هم
اسکندر و سرچشمۂ آبی که زلال ست
ما و لب لعلیں که شرابست و شکر هم
آن خانه برانداز بدل پرده نشینست
اے دیده تو نامحرمے و حلقۂ در هم

هم بعالم ز اهل عالم برکنار افتاده ام
چون امام سبحه بیرون از شمار افتاده ام
کار و بار موج با بحر ست خودداری مجوی
در شکست خویشتن بے اختیار افتاده ام

.بود بدگو ساده با خود همزبانش کرده ایم
از وفا آزُردنَت خاطر نشانش کرده ام
گوشۂ چشمش ببزم دلربایان بامَنَست
وقت من خوش باد کز خود بدگمانش کرده ام
تا نیارد خورده بر بدمستی دوشم گرفت
بوسه را در گفتگو مُهر دهانش کرده ام
غالب از من شیوۂ نطق ظهوری زنده گشت
از نوا جان در تن ساز بیانش کرده ام

میربایم بوسه و عرض ندامت میکنم
اختراعی چند در آداب صحبت میکنم

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانهٔ در کوے ترسایاں عمارت میکنم
کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم
زنگ غم زآئینهٔ دل جز بمی نتواں زدود
دردم از دہرست و با ساقی شکایت میکنم
غالبم غالبؔ ہم آئین برنتابم در سخن
بزم برہم میزنم چنداں کہ خلوت میکنم

غالبؔ ایں لعب بگل مہر رضاجوئی تست
تو خریدار گہر باش گہر بنمائم

تا کی صرف رضاجوئی دلہا باشم
فرصتم باد کزیں پس ہمہ خود را باشم
ہمچوں آں قطرہ کہ بر خاک فشاند ساقی
دورم از کنج لبت گر ہمہ صہبا باشم
قبلهٔ گم شدگان رہ شوقم غالبؔ
لاجرم منصب من نیست کہ یکجا باشم

گزشتم از گلہ در وصل فرصتم بادا
زبان کوتہ و دست دراز میخواہم
گرفتہ خاطر از اسباب دسترخوشی باقیست
ترانہ کہ نہ گنجد بہ ساز میخواہم

ز من حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم
ز مردیں بنود خاتم گدا دریاب
کہ خود چہ زہر بود کان تہ نگیں دارم
ترا نہ گفتم اگر جان و عمر معذورم
کہ من وفاے تو با خویشتن یقیں دارم

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
"خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم"

بیاکہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
زچشم ودل بتماشا تمتع اندوزیم
زجان وتن بمدارا زیاں بگردانیم
بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بہ کوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیرودار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم
مَی آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکار و بار زنی کارداں بگردانیم
گہی بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم
گہی بہ بوسہ زبان در دہاں بگردانیم
نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم
بشوخئ کہ رخِ اختراں بگردانیم
ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم
بلائے گرمیِ روز از جہاں بگردانیم
بوہم شب ہمہ را در غلط بیندازیم
ز نیمہ رہ رمہ را با شباں بگردانیم
بجنگ باج ستانانِ شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشانانِ صبح گاہے را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوی خاوراں بگردانیم
بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیاکہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

دانش و گنجینه پنداری یکیست
حق نهان دادانچه پیدا خواستیم
قطع خواهشها ز ما صورت نداشت
همّت از غالبؔ همانا خواستیم

نیَم در بند آزادی ملامت شیوه‌ها دارد
شنیدم جامهٔ زندان ترا عیبست میپوشم
خدایا زندگی تلخست گر خود نقل و مَی نبود
دلی ده کز گداز خویش گردد چشمهٔ نوشم
مرنج از وعدهٔ وصلی که با من در میان آری
که خواهد شد بذوق وعدهٔ دیگر فراموشم
بهارِ گلشن کوی توام مسپار در خاکم
چراغ بزم نیرنگ توام مپسند خاموشم

وحشتی در سفر از برگ سفر داشته ایم
توشهٔ راه دلے بود که برداشته ایم
ناله تا گم نکند راه لب از ظلمت غم
جان چراغیست که بر راهگزر داشته ایم
داغ اِحسانِ قبولی ز لئیمانش نیست
ناز بر خرّمی بختِ هنر داشته ایم
بیش ازیں مشرب ما نیز سخن سازی بود
لختی از خوشدلی غیر خبر داشته ایم
وارسیدیم که غالبؔ بمیان بود نقاب
کاش دانیم که از روے که برداشته ایم

یارب بشهوت و غضبم اختیار بخش
چندان که دفعِ لذت و جذبِ الم کنم
تا دخل من بعشق فزوں تر بود ز خرج
خواهم که از تو بیش کشم ناز و کم کنم
خشکست کشت شیوهٔ تحریر رفتگاں
سیرابش از نمِ رگِ ابر قلم کنم

بیا لطف ہوا بنگر کہ چون موج مے از مینا   گل از شاخ گلستی جلوہ گر پیش از دمیدن ہم
نہ از مہرست گر بر داستانم می نہد گوشی   ہمان از نکتہ چینی خیزدش ذوق شنیدن ہم
چہ پرسی کز لبت وقت قدح نوشی چہ میخواہم   ہمین بوسیدنی چون مست تر گردی مکیدن ہم
ادب آموزیش در پردۂ محراب می بینم   نخست از جانبِ حق بودہ اندازِ خمیدن ہم
نخواہد روزِ محشر دادخواہِ خویش عالم را   بتو بخشید ایزد شیوۂ ناز آفریدن ہم
دل از تمکین گرفت و تاب وحشت نبودم غالب   نگنجد در گریبان من از تنگیِ دریدن ہم

خاموشم و در دل ز ملالم اثرے نیست   سرجوش گداز نفسم لائے ندارم
ناز تو فراوان بود و صبر من اندک   تو دست و دلی داری و من پائے ندارم
بگذار کہ از راہ نشینان تو باشم   پائے کہ شود مرحلہ پیمائے ندارم

زخم جگرم بخیہ و مرہم نپسندم   موج گہرم جنبش و رفتار ندانم
نقدِ خردم سکۂ سلطان نپذیرم   جنس ہنرم گرمی بازار ندانم
غالب نبود کوتہی از دوست ہمانا   زانسان دہدم کام کہ بسیار ندانم

در ہر انجام محبت طرح آغاز افگنم   مہر بردارم ازو تا ہم برو باز افگنم
ہر قدر کز حسرت آبم در دہن گردد ہمے   ہم ز استغنا بروے بخت ناساز افگنم

ترکِ صحبت کردم و در بندِ تکمیلِ خودم
نغمہ ام جان گشت خواہم در تنِ سازِ افگنم

اے ز سازِ زنجیرم در جنوں نواگر کن
بند گر بدین ذوق ست پارۂ گراں تر کن
زانچہ دل زہم پاشد لب چہ طرف بر بندد
یا مجالِ گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن
زین درونہ کاویہا گوہرم بکف نامد
خدمتی معین شد اجرتے مقرر کن
بخششِ خداوندی گر فراخورِ ظرف ست
ہم بہوش بیشی دہ ہم بہ مَی توانگر کن

ہا پری شیوہ غزالاں وز مردم رَمِ شان
دلِ مُردم بخمِ طرّۂ خم در خمِ شان
آشکارا کُش و بدنام و نکونامے جوی
آہ ازیں طائفہ و آنکس کہ بود محرمِ شان
رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شان
اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بما منتِ بسیار نہے از کمِ شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شان مشک فشان از دمِ شان
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شان
غالبِ سوختہ جان گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدمِ شان

جنون مستم بفصلِ نوبہارم میتواں کشتن
صراحی بر کف و گل در کنارم میتواں کشتن
بجرمِ اینکہ در مستی بپایاں بردہ ام عمری
بکوے میفروشاں در خمارم میتواں کشتن

طاق شد طاقت ز عشقت برکران خواہم شدن   مہربان شو ورنہ برخود مہربان خواہم شدن
خار و خس ہر گہ در آتش سوخت آتش میشود   مردم از ذوق لبت چنداں کہ جاں خواہم شدن
بسکہ فکر معنے نازک ہمے کاہد مرا   شاہد اندیشہ را موی میاں خواہم شدن

دل زاں مژۂ تیز بیک بار کشیدن   دامن بدر شتے بود از خار کشیدن
دارم سر این رشتہ بدالسان کز دیر م   تا کعبہ توان برد بزنّار کشیدن
حق گویم و نادان بزبانم دہد آزار   یارب چہ شد آن فتوئ بردار کشیدن
ز آسایش دل گرچہ مرادی و گرم نیست   باری نفس چند بہ ہنجار کشیدن
فرجام سخن گوئے غالب بتو گویم   خون جگر ست از رگ گفتار کشیدن

فصلے از باب شکستِ رنگ انشا کردہ ام   میتواں راز درونم خواند از سیمائے من
مست در دم ساز و برگ انتعاشم نالہ ست   بے شکستن بر نیاید بادہ از مینائے من
خاطر منت پذیر و خوے نازک دادہ   گر بہ بخشی شرمسارم ورنہ بخشی وائے من

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن   حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن
شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس   اینقدر دانم کہ دشوارست آسان زیستن
بردگوی خرّمی از ہر دو عالم ہر کہ یافت   در بیابان مردن و در قصر و ایوان زیستن

راحت جاوید ترک اختلاط مردمست   چون خضر باید ز چشم خلق پنہاں زیستن
تا چہ راز اندر تہ ایں پرده پنہاں کرده اند   مرگ مکتوبی بود کو راست عنواں زیستن
روز وصل یار جان ده ورنہ عمرے بعد ازیں   ہمچو ما از زیستن خواہی پشیماں زیستن
با رقیباں ہمقفیم اما بدعوی گاه شوق   مردنست از ما وزیں مشتی گرانجاں زیستن
بر نوید مقدمت صد بار جان باید فشاند   بر امید وعده ات زنہار نتواں زیستن

خیره کند مرد را ہمہ درم داشتن   حیف ز ہمچوں توئی چشم کرم داشتن
وائے ز دل مردگی خوے بد انگیختن   آه ز افسردگی روے دژم داشتن
تازگی شوق چیست رنگ طرب ریختن   چہره ز خوناب چشم رشک ارم داشتن
با ہمہ اشکستگی دم ز درستی زدن   با ہمہ دلخستگی تاب ستم داشتن
در خم دام بلا بال فشان زیستن   با سر زلف دوتا عہد بدہم داشتن
بہر فریب از ریا دام تواضع مچیں   دل نزباید ہمی تیغ ز خم داشتن
نقش پے رفتگاں جاده بود در جہان   ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن
غالب آواره نیست گرچہ بہ بخشش سزا   خوش بود از چو توئی چشم کرم داشتن

چہ غم ار بجد گرفتی ز من احتراز کردن   نتواں گرفت از من بگذشتہ ناز کردن
تو و در کنار شوقم گره از جبیں کشودن   من و بر رخ دو عالم در دل فراز کردن

نفسم گداخت شوقت ستمست گر تو دانی   کہ ز تاب نالہ خون شد نہ زپاس راز کردن
ہلہ تازہ گشتہ غالبؔ روش نظیریؔ از تو   سزد اینچنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردن

خجل ز راستیِ خویش میتوان کردن   ستم بجان کج اندیش میتوان کردن
تو جمع باش کہ ما را دریں پریشانے   شکایتیست کہ با خویش میتوان کردن
سر از حجاب تعین اگر برون آید   چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش میتوان کردن
اگر بقدر وفا میکنی جفا حیف ست   بمرگ من کہ ازیں بیش میتوان کردن
کسی بجو کہ مرا ورا درین سفر غالبؔ   گواہِ بیکسیِ خویش میتوان کردن

خاکی بروے نامہ فشاندیم مفت تست   ناخواندہ صفحہ حال زعنوان شناختن
مائیم و ذوق سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ   در عشق نیست کفر ز ایمان شناختن
غالبؔ بقدر حوصلہ باشد کلامِ مرد   باید ز حرف نبض حریفان شناختن

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن   ایں مَی از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
ہم سواد صفحہ مشک سودہ خواہد ریختن   ہم دوامم ناف آہوے ختن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت   دستگاہ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

ہے چہ میگویم اگر اینست وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن
چشم کور آئینہ دعوی بکف خواہد گرفت
دست شل مشاطۂ زلف سخن خواہد شدن
شاہد مضمون کہ اینک شہری جان و دلست
روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن
زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں
ہمنوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن
شاد باش ای دل دریں محفل کہ ہر جا نغمہ ایست
شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن
ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید
ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن
پردہ ہا از روے کار ہمدگر خواہد فتاد
خلوت گبر و مسلماں انجمن خواہد شدن
گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست
بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن
در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

حق کہ حقیقت سمیعت فلانے بشنو
بشنو گر تو خداوند جہانے بشنو
لن ترانی بجواب ارنی چند و چرا
من نہ اینم بشناس و تو نہ آنے بشنو
سوئے خود خوان و بخلوت گہ خاصم جا دہ
انچہ دانی بہ شمار اُنچہ ندانے بشنو
لحنی آئینہ برابر نہ و صورت بنگر
پارۂ گوش بہ من دار و معانے بشنو
ہر چہ سنجم بتو ز اندیشۂ پیرے بپذیر
ہر چہ گویم بتو از عیش جوانے بشنو
داستان من و بیداری شبہای فراق
تا نہ خسپی و بپاسم نفشانے بشنو
چارہ جو نیستم و نیز فضولے نکنم
من و اندوہ تو چندانکہ توانے بشنو

زینکہ دیدی بہ جحیم طلب رحم خطاست   سخنی چند ز غمہائے نہانے بشنو

محو افسون گرِ نازیم کہ او را با ما   دور باشیست کہ آہنگ بیا خیزدازو
دیگر امروز بما بر سرِ جنگ آمدہ ست   بہ ادائی کہ ہمہ صلح و صفا خیزدازو
بلبلِ گلشنِ عشق آمدہ غالبؔ زازل   حیف گر زمزمۂ مدح و ثنا خیزدازو

در بادۂ طہور غم محتسب کجا   در عیش خلد لذت بیم و زوال کو
غالبؔ بشعر کم ز ظہوریؔ نیم و لے   عادل شہِ سخن رس دریا نوال کو

دولت بہ غلط نبوَد از سعی پشیمان شو   کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو
از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن   جوئیٔ بخیابان رو سیلے بہ بیابان شو
ہم خانہ بسامان بہ ہم جلوہ فراوان بہ   در کعبہ اقامت کن در بتکدہ مہمان شو
آوازۂ معنیٔ را بر ساز دبستان زن   ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلان شو
گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرمان نہ   در گوئیٔ زمین باشی وقف خم چوگان شو
در بند شکیبائیٔ مردم ز جگر خائے   اے حوصلہ تنگی کن اے غصہ فراوان شو
جان داد بغم غالبؔ خشنودی روحش را   در بزم عزا می کش در نوحہ غزلخوان شو

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست بہ صہبا گشودہ
در بزم غالبؔ آئی و بشعر و سخن گرائے
خواہی کہ بشنوی سخنِ ناشنودہ

گر نہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش
جان فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردہ
ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمرست
انتقامست اینکہ با مجرم مدارا کردہ
صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودہ
مژدہ باد آنرا کہ محو ذوق فردا کردہ
چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازان کاین در رسد آنرا مہیا کردہ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہرست
خویش را در پردۂ خلقی تماشا کردہ

خواستم شکوۂ بیداد تو انشا کردن
قلم از جوش رقم شد خس طوفان زدہ
وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ وا شدۂ مہر بعنوان زدہ
بُرد در انجمن شعلہ رخانم غالبؔ
ذوق پروانۂ بر روئے چراغان زدہ

بر دست و پاے بند گرانے نہادہ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ
ایمن نیم ز مرگ اگر رستہ ام ز بند
دلدوز ناوکے بہ کمانے نہادہ
گوہر ز بحر خیزد و معنی ز فکر ژرف
بر ما خراج طبع روانے نہادہ
غالبؔ ز غصہ مرد ہمانا خبر نداشت
کاندر خرابہ گنج نہانے نہادہ

بگوشم میرسد از دور آواز درا امشب   دلی گم گشتۂ دارم کہ در صحراست پنداری
از و باور ندارد دعویٰ ذوق شہادت را   نگاہش با رقیب و خاطرش با ماست پنداری

گر نہ نواہا سرود مے چہ غمستی   منکہ نیم گر نبود مے چہ غمستے
لے بہ سخن مزد لے ستایش اگر من   کشتِ کدیور درود مے چہ غمستے
نیست مشامی شمیم جوئے اگر من   غالیہ چندین نسود مے چہ غمستے
چون دَرِ دعوے توان بہ لغو کشودن   من بہ ہنر گر کشود مے چہ غمستے
چون دل یاران توان بہزل ربودن   من بہ سخن گر ربود مے چہ غمستے

اے بہ صدمۂ آہی بر دلت زما باری   اینقدر گران نبود نالہ ز بیماری
غم چہ در ربود از ما اینک آنچہ بود از ما   سینۂ و اندوہی خاطرے و آزاری
اے فنا دَرے بکشا بو کہ در تو بگریزد   ہم ز خلق نومیدی ہم ز خویش بیزاری
ناز مومن و کافر بر چہ دستگاہ آخر   سبحۂ و مسواکے قشقۂ و زنّاری
شوخی شمیمش بین جنبش نسیمش بین   غنچہ راست آہنگی سرو راست رفتاری

نخواہم از صف حوران ز صد ہزار یکے   مرا بس است ز خوبان روزگار یکے
سراغ وحدت ذاتش توان ز کثرت جست   کہ سائر است در اعداد بیشمار یکے

چگویم از دل و جانی کہ در بساط منست
ستم رسیدہ یکے ناامیدوار یکے
دو برق فتنہ نہفتند در کف خاکے
بلائے جبر یکے رنج اختیار یکے
مَرَوز آئینہ خانہ کہ خوش تماشائیست
یکے تو محو خودی و چو تو ہزار یکے
زہے نگاہِ سبکسیر و شرم دور اندیش
یکے بُدزدی دل رفت و پردہ دار یکے
چہ شد کہ ریخت زبان رنگ صد ہزار سخن
بخون سرشتہ نوائے ز دل برآر یکے
دم از ریاست دہلی نمیزنم غالبؔ
منم ز خاک نشینانِ آن دیار یکے

غم راست بدلسوزی سعی ادب آموزی
انداختہ گانش را اندازہ نشانستے
صد رہ بہوس خود را با وصل تو سنجیدم
یک مرحلہ تن وانگہ صد قافلہ جانستے
جان باغ و بہار آما در پیش تو خاکستے
تن مشت غبار آما در کوئی تو جانستے
ساقی بزر افشانے دائم ز کریمانستے
پیمانہ گران تر ہست گر بادہ گرانستے
فیض ازلے بنود مخصوص گروہی را
حرفیست کہ مے خوردن آئینِ مغانستے
غالبؔ سرِ خُم بکشا پیمانہ مے در زن
آخر نہ شب ماہست گیرم رمضانستے

تا ہم ز دل بُرد کافر ادائے
بالا بلندی کوتہ قبائے
از خوئے ناخوش دوزخ نہیبے
وز روئے دلکش مینو لقائے
زردشت کیشی آتش پرستے
بر سم گزاری زمزم سرائے

چون مرگ ناگہ بسیار تلخے   چون جان شیریں اندک وفائے
درکام بخشے مُمسِک امیری   دردلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازی پوزش پسندے   طاقت گدازی صبر آزمائے
درکینہ ورزی تفسیدہ دشتے   در مہربانی بستاں سرائے
اززلف پرخم مشکیں نقابے   ازتابش تن زرّیں ردائے
درعرض دعوے لیلے نکوہے   بررغم غالبؔ مجنوں ستائے

بدل زعربدہ جائی کہ داشتی داری   شمار عہدوفائے کہ داشتی داری
توکَی زجور پشیماں شدی چہ میگوئے   دروغ راست نمائی کہ داشتی داری
بسینہ چون دل و دردل چو جان خزیدی باز   نگاہ مہر فزائی کہ داشتی داری
عتاب و مہر تو ازہم شناختن نتواں   خرد فریب ادائی کہ داشتی داری
خراب بادۂ دوشینۂ سرت گردم   ادائے لغزش پائی کہ داشتی داری
جہانیان زتو برگشتہ اند گر غالبؔ   تراچہ باک خدائی کہ داشتی داری

شاد باش اے غم زبیم مرگم ایمن ساختی   گشت صرف زندگانی بود گر دشواریے
باخرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی   گفت ہی خواب گرانی از پس بیداریے
زلّہ بردار ظہوری باش غالبؔ بحث چیست   درسخن درویشیِ باید نہ دکّان داریے

رفت آنکہ کسب بوی تو از باد کردمے   گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہ تو جان دادمی ز ذوق   از موجِ گردِ رہ نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر لبت نہ بنفریں نواختے   رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ جانبِ رخ و قدّت گرفتمے   در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
رفت آنکہ در ادائے سپاس پیامِ تو   ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمے
اکنون خود از وفائے تو آزار می کشم   رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے
بندم منہ ز طرّہ کہ تابم نماندہ است   رفت آنکہ خویش را ببلا شاد کردمے
آخر بداد گاہ دگر اوفتاد کار   رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمے
غالبؔ ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است   رفت آنکہ عزمِ خلخ و نوشاد کردمے

بہ توانائیٔ کوششِ نتوان یافت ترا   سرخوشیہائے قبولِ ازلی را مانے
جز بچشم و دلِ والا گہران جا نہ کنے   جلوۂ نقشِ کفِ پائے علی را مانے
بدل ہر کہ بچشم تو در آید ناگاہ   داری آن مایہ تصرّف کہ ولی را مانے
اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالبؔ   گر ترقی نکنم شیخ علی را مانے

اے کہ گفتم ندہی دادِ دل آری ندہی   تا چو من دل بمغان شیوہ نگاری ندہی
چشمۂ نوش ہمانا تراود ز دلے   کش بگیری و در اندیشہ فشاری ندہی

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند   تو کہ باشی کہ بخود زحمت کاری ندہی
رہزنان اجل از دست تو ناگاہ برند   نقد ہوشی کہ بسوداے بہاری ندہی
بہ خم طرّۂ حوران بہشت آویزند   ناز پروردہ دلی راکہ بہ یاری ندہی
گر تنزل بتود ابر بہارے غالبؔ   کہ دُر افشانی و زر افشاندہ شماری ندہی

فرقیست نہ اندک ز دلم تا بہ دل تو   معذوری اگر حرف مرا زود نیابے
در مشرب ما خواہش فردوس بجوے   در مجمع ما طالع مسعود نیابے
در بادۂ اندیشۂ ما دُرد نہ بینے   در آتش ہنگامۂ ما دود نیابے
غالبؔ بہ دکانی کہ بامید کشودیم   سرمایۂ ما جز ہوس سود نیابے

سرچشمۂ خونست ز دل تا بزبان ہاے   دارم سخنی با تو و گفتن نتواں ہاے
سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان   نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہاے
باد آورِ ناگفتہ شنو رفت حوالت   دردی کہ بہ گفتن نہ پزیرفت گراں ہاے
از جنت و سرچشمۂ کوثر چہ کشاید   خون گشتہ دل و دیدۂ خونابہ فشاں ہاے
سیماب تنی کز رم برقست نہادش   گر دیدہ مرا مایۂ آرامش جاں ہاے

بوے گل و شبنم نسزد کلبۂ ما را   صرصر تو کجا رفتی و سیلاب کجائے

حشرست و خدا داور و ہنگامہ بپایاں
اے شکوۂ بے مہری احباب کجائے
باگرمیِ ہنگامۂ خواہش نہ شکیبم
آتش بہ شبستان زدم اے آب کجائے

آنکہ جوید از تو شرم و آنکہ خواہد از تو مہر
تقوے از میخانہ و داد از فرنگ آرد ہمی
گر نہ در تنگی دہان دوست چشم دشمنست
از چہ رو بر کام محبوبان کار تنگ آرد ہمی

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقص بتان آزری
تا نبود بہ لطف و قہر ہیچ بہانہ درمیاں
شکر گرفت نارسا شکوہ شمرد سرسری
اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہِ تو روے نیست
در طلبت توان گرفت بادیہ را برہبری
ہر کہ دلست در برش داغ تو رویدش ز دل
تا چو بدیگرے دہد باز برے بداوری
رشکِ ملک چہ و چرا چون بتو رہ نمی برد
بیہدہ در ہواے تو می پرد از سبکسری
حیف کہ من بخون تپم و ز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمرے نالہ بہ سینہ بشکری
بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

زبسکہ با تو بہر شیوہ آشنا ستمے
بہ عشق مرکزِ پرکار فتنہ ہا ستمے
امیدگاہ من و ہمچو من ہزار کسیت
ز رشک در صدد ترک مدعا ستمے
سخن ز دشمن و غمہاے ناگوارش نیست
ز دوست داغ ستمہاے ناروا ستمے

چگونہ تنگ توانم کشیدنت بکنار   کہ با تو در گلہ تنگیٔ قباستے
بباده داغ خودی از رواں فروشستہ   ہلاکِ مشربِ رندانِ پارساستے

گلویم تشنہ و جان و دلم افسردہ ہی ساقی   بدہ نوشینہ داروے کہ ہم آتش ہم آبستے
نگویم ظالمی اما تو در دل بودۂ وانگہ   دلی دارم کہ ہمچون خانہ ظالم خرابستے
منال از عمر و ساز عیش کن کز باد نوروزے   بہ گلشن جلوہ رنگینئے عہد شبابستے

غزلیات از مجموعۂ سبدِ چیں

اے خداوند خردمند و جہان داور دانا   شے بہ نیروئے خرد بر ہمہ کردار توانا
اے بہ رفتار و بدیدار ز زیبائیٔ و خوبی   سروِ نوخاستہ، آسا مہِ ناکاستہ مانا
بہ ادا، پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا   بکرم ابر عطایا، بغضب برق سنانا
بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن بذلہ طرازا   بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا

جز دفع غم ز بادہ نبودست کام ما   گوئی چراغِ روز سیاہ است جام ما
اے بادِ صبح عطرے ازاں پیرہن بیار   تسکین ز بوئے گل نپذیرد مشام ما
غالب بقولِ حضرت حافظ ز فیضِ عشق   "ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما"

ہلہ من عاشقِ ذاتم تنہ ناہا یا ہو   ناظرِ حسن صفاتم تنہ ناہا یا ہو
موسیٰ و حصرِ تماشائے تجلی بہ طور   من نہ در بندِ جہاتم تنہ ناہا یا ہو
ظلمتِ کفر ببیں روشنی طبع نگر   چشمۂ آبِ حیاتم تنہ ناہا یا ہو
مجرمِ عالمِ ارواح بپاداشِ عمل   خستۂ قیدِ حیاتم تنہ ناہا یا ہو
تکیہ بر مغفرتِ اوست نہ بر طاعتِ خویش   تارکِ صوم و صلوٰتم تنہ ناہا یا ہو
چشم دارم کہ بہ رو ی دہد بے خبری   جز بدیں نیست نجاتم تنہ ناہا یا ہو
غالبم تشنۂ تلخاب نہ ہم چوں حافظ   "مایلِ شاخِ نباتم" تنہ ناہا یا ہو

از جسم بجاں نقاب تاکے   ایں گنج دریں خراب تاکے
ایں گوہرِ پر فروغ یارب   آلودۂ خاک و آب تاکے
بیتابیٔ برق جز 'دمے' نیست   ما' دریں ہمہ اضطراب تاکے
جان در طلبِ نجات تاچند   دل در تعبِ عتاب تاکے
غالبؔ بچنیں کشاکش اندر   یا حضرتِ بوتراب تاکے

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند   برو، برو کہ ازاں سو بیا بیا گویند
کسے کہ پائے ندارد چگونہ راہ رود   خود اہلِ شرع دریں داوری چہا گویند
دم از 'وجودکَ ذنبٌ' زنند بے خبران   چسان عطیۂ حق را گناہِ ما گویند

بلے گناہ بود دعوئ وجود از ما   بہ اہل راز چنیں گوئی تا بجا گویند
نکردہ زر مسِ خود را و بہرِ عرضِ فریب   بہ پیشِ خلق حکایت زکیمیا گویند
کساں کہ دعوئ نیکی ہمی کنند مرا   اگر نہ نیک شمارند بد چرا گویند
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا   بس است ہم چو توئی را کہ پارسا گویند
بگوئی مردہ کہ در دہر کارِ غالبِ زار
ازاں گذشت کہ درویش و بے نوا گویند

ازمجموعہ سَبَد چین

عبودیت نکند اقتضائے خواہش کار   دعا بصیغہ امرست و امر بے ادبیست

رباعیات

غالب بہ گہر زدودۂ زادشمم
زان رو بہ صفاے دمِ تیغست دمم
چون رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاگان قلمم

راہیست زعبد تا حضور اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبے کہ نشانہا دارد
سرچشمۂ وسایہ الیست درنیمۂ راہ

آن مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصۂ فراغتش ہمانا نبود
داد بجہاں خانہ و زن نیست درو
نازم بخدا چرا توانا نبود

چرگر ز زخمہ زخشم بر چنگ زند   پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی خوشی پنہانست   گازر نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

با دست غم آں باد کہ حاصل ببرد   آبِ رخ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشتہ ام خمی ز صہبا بہ پسر   کش اندہِ مرگ پدر از دل ببرد

زانجا کہ دلم بہ وہم در بند نبود   با ہیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر   جز ترک دیار و زن و فرزند نبود

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری   نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند میخرامی دانم   در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

زیں موے کہ بر میانِ تست اے بدکیش   باشد کمرت خجل ز بے برگی خویش
آمیزش موئے با میانے کہ تراست   ہمسایگے توانگرست و درویش

در بزم نشاط خستگان را چہ نشاط   از عربدہ پائے بستگان را چہ نشاط
گر ابر شرابِ ناب بارد غالبؔ   ما جام و سبو شکستگان را چہ نشاط

قانع نیم ار بہشت نیزم بخشند
از بخشش خاص تا چہ چیزم بخشند
امید کہ صرفِ رونمائے تو شود
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیِ دہر
ریزد ہمہ دُرد و دَرد و تلخابۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بہ غمزہ کُشت و مرّیخ بہ قہر

یارب بجہانیان دلِ خرّم دہ
در دعوی جنّت آشتی باہم دہ
شدّاد پسر نداشت باغش از تست
آن مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

خوشتر بود آب سوہَن از قند و نبات
باوی چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
ایں پارہ عالمی کہ ہندش نامند
گوئے ظلمات و سوہنست آبِ حیات

شرطست کہ روے دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن
چون کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

غالبؔ ہر پردۂ نوائے دارد
ہر گوشۂ ازد ہر فضائے دارد
ہر چند یبوست ازدماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

غالب روش مردم آزاد جداست   رفتار اسیران رہ وزاد جداست
ما ترک مراد را ارم میدانیم   واں باغچۂ ضبطے شدّاد جداست

ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است   بر خاک رہِ عجز سری داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بہ دعوے طلبد   شداد ہمانا پسرے داشتہ است

کشتے از موج سوئے ساحل برود   رہرو از جادہ تا منزل برود
خود شکوہ دلیلِ رفعِ آزار بست   آید بزباں ہر انچہ ازدل برود

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش   آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم   با حسرتِ عیشہائے ناکردۂ خویش

غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست   از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مَی خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار   ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

غالب غم روزگار ناکامم کُشت   از تنگیِ دل بحلقۂ دامم کشت
ہم غیرتِ سربزرگیِ خاصم سوخت   ہم رشکِ نشاط مندیِ عامم کُشت

آنرا کہ بود درستے در فن جام
ہم محرم خاص آید و ہم مرجع عام
آسان نبود کشاکش پاسِ قبول
زنہار نگردی بہ نکوئے بدنام

درعالم بے زری کہ تلخست حیات
طاعت نتوان کرد بامیّد نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ
بودی بوجودِ مال چوں حج و زکوات

ہر چند زمانہ مجمع جہّال ست
در جہل نہ حال شان بیک منوالست
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے
فرق خرِ عیسیٰؑ و خرِ دجّال ست

تا میکشؔ و جوہرؔ دو سخنور داریم
شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکشؔ از ماست
در معرکہ تیغیم کہ جوہرؔ داریم

اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا
از کوچہ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام
برگفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

شب چیست سویدائے دل اہل کمال
سرمایہ دہِ حسن بزلف و خد و خال
معراج نبی بشب ازاں بود کہ نیست
وقتے شایستہ تر ز شب بہر وصال

ہر چند تواں بے سر و ساماں بودن   بازیچۂ خوئ زشت نتواں بودن
باللہ کہ زدشنہ بر جگر سخت ترست   از کردۂ خویشتن پشیماں بودن

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر   از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بیمایہ بفکر سود ماندم ہمہ جا   بیوعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

دارم دل شاد و دیدۂ بینائے   وز کرّی گوشم نہ بود پروائے
خوبست کہ نشنوم ز بہر خود رائے   گلبانگ انا ربکم الاعلائے

آنرا کہ ز دست بے زری پامال ست   رسوائی نیز لازم احوال ست
ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مَی   ساقیؔ مگرش پیالہ از غربال ست

اوراق زمانہ درنوشتیم و گزشت   در فنّ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
مَی بود دوائے ما بہ پیری غالبؔ   زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

گر ذوق سخن بدہر آئین بودے   دیوانِ مرا شہرت پَروین بودے
غالب اگر ایں فنِّ سخن دیں بودے   آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

از مجموعهٔ "سبد چین" و "باغ دو در"

زینسان کہ ہمیشہ در روانی مائیم سرچشمهٔ راز آسمانی مائیم
لختے ز دساتیر بود نامهٔ ما ساسان ششم بہ کاردانی مائیم

ہر چند خرد ز تاب می پست شود وز ضعف خرد وہم قوی دست شود
ہر کس کہ خرد دارد ازیں جوہر ناب آنمایہ چرا خورد کہ بدمست شود

اے دادہ بباد عمر در لہو افسوس زنہار مشو ز رحمت حق مایوس
ہشدار کز آتش جہنم حق تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

از دہر دلم دایہ زہر در می جست از بادهٔ ناب یکدو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بمن آبے کہ برائے خود سکندر می جست

یارب تو کجائی کہ بما زر ندہی بیدرد خدائی کہ بما زر ندہی
نے نے تو نہ غائبی و نہ بیرحمی بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندہی

مؤلف : ظ انصاری
آرٹسٹ : فیض مجدد
خوشنویس : سلامت رضوی، عبدالسلام، شمس اعظمی اور محمد قاسم
ترتیب و تزئین : نورالدین آزاد
کتابت : مارچ سنہ ۱۹۶۹ء
طباعت : فروری سنہ ۱۹۷۲ء
تعداد اشاعت : ۱ ہزار — (بار اول)
طابع : لیڈرز پریس، لوہین ممبئی ۱۰

ملنے کے پتے

○ مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
○ مکتبۂ جامعہ، پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال ممبئی ۳
○ علوی بکڈپو، محمد علی روڈ ممبئی ۳
○ خواجہ پبلشنگ ہاؤس، ۴۱ ٹینک اسٹریٹ ممبئی ۵

قیمت : ۱۵ روپے

ظ - انصاري كي كچھ تحريريں

جارج برنارڈ شا (١٩٥١ء) حيات اور فن كا مطالعه (مكتبه برهان۔ اردو بازار دهلی)

ورق ورق (١٩٥٢ء) نثر پارے - تاثرات (علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی 3)

کمیونسٹ اور مذهب (١٩٥٨ء) نظریاتی اور عملی پهلو (مکتبه شاهراه) اردو بازار دهلی

زبان و بیان (١٩٥٩ء) تنقیدی مضامین۔ آزاد کتاب گهر (اردو بازار دهلی)

روس کا شاعر اعظم، پوشکن (١٩٦٦ء) حیات اور فن کا مطالعه (زیر طبع)

شعروشاعري (١٩٧٣ء) پوشکن کے کلام کے ٥٣٠٠ مصرعے - منظوم مع دیباچه

غالب شناسي (١٩٦٥ء) حیات اور فن کا مطالعه (علوی بک ڈپو بمبئی 3)

چے خف (١٩٧٤ء) حیات اور فن کا مطالعه (ترقی اردو بورڈ - نئی دهلی)

سوویت مشاعره (١٩٧٤ء) موجوده روس کے پندره شعرا کا کلام مع تعارف مطبوعه ماسکو - (یه مطبوعات مکتبه جامعه لمٹیڈ - دهلی. بمبئی سے بهی مل سکتی هیں)

ترجمے

انقلاب روس (١٩٤٦ء) هیولٹ جانسن (قومی دارالاشاعت - لاهور)

چيني گاؤں (١٩٤٩ء) تئیں چین کا ناول (کتب پبلشرز - بمبئی)

زلفوں کے سائے میں (١٩٥١ء) چینی ناولٹ (مکتبه شاهراه اردو بازار دهلی)

چين كي بهترین کهانیاں (١٩٥٣ء) (مکتبه شاهراه - اردو بازار دهلی)

استالین (دو جلدوں میں) (۱۹۵۳ء) مضامین اور سوانح عمری (P. P. H. نئی دھلی)

مارکسی تعلیم کا سلسلہ (۱۹۵٤ء) (۱۳ جلد) تاریخ، فلسفہ اور اقتصادیات پر مقالے
(P.P.H. نئی دھلی)

روس کی بہترین کہانیاں (۱۹۶۲ء) تین جلدوں میں انتخاب (روسی زبان سے)
پروگریس اشاعت گھر۔ ماسکو

سوویت یونین کی تاریخ (۱۹۶۲ء) مکمل (جدید) تاریخ۔ ضخیم کتاب
(پروگریس اشاعت گھر۔ ماسکو)

دستو ئیفسکی (۱۹۵۸ء) بچارے لوگ (ناول) خواب پریشان (ناول)
(۱۹۷۲ء) جواری (ناول) ذلتوں کے مارے لوگ (ناول)

پوشکن (۱۹۶۰ء) حکم کی بیگم (ناول) منظوم کہانیاں دو ہزار شعر
/ منظوم ترجمے

چیخف تین سال (ناول)

لیو تالستائے سوانح عمری (جلد اول)

آئتماتوف جمیلہ (ناول)

مارکس اینگلس کی منتخب تصانیف (۱۹۷۱-۷٤ء)
۳ جلدوں میں۔ پروگریس پبلشر - ماسکو

خمسہ امیر خسرو (۱۹۷۲-۷٤ء) متن علمی و تنقیدی ۵ جلدوں میں

انتخاب غالب۔ مجموعہ مضامین - منظوم بزبان روسی
دو کتابیں اشاعت کے لئے تیار کیں

۵۵ ہزار الفاظ کے دو جامع لغت: اردو روسی لغت۔ روسی اردو لغت مطبوعہ ماسکو

Form No.] Book No.........

University Library, Allahabad

Date Slip

The borrower must satisfy himself before leaving the counter about the condition of the book which is certified to be complete and in good order. The last borrower is held responsible for all damages.

An overdue charge will be charged if the book is not returned on or before the date last stamped below.